مراٹھی نیا افسانہ
بے چہرہ شام
ترجمہ و ترتیب
یونس اگاسکر

بے چہرہ شام

مراٹھی نیا افسانہ

بے چہرہ شام

(مراٹھی نیا افسانہ)

ترجمہ و ترتیب

یونس اگاسکر

قلم پبلی کیشنز، باپو کھوٹے اسٹریٹ، بمبئی ـ ۳

کتاب : بے چہرہ شام

نوعیت : مراٹھی افسانوں کے تراجم

ترجمہ و ترتیب : یونس اگاسکر

اشاعتِ اوّل : اگست ۱۹۸۷ء

تعداد : ایک ہزار

سرورق : ہمت رائے شرما

طابع : قلم پبلی کیشنز، ۷۰ باپو کھوٹے اسٹریٹ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

قیمت : ۴۰ روپے

تقسیم کار :
- قلم پبلی کیشنز،
- مکتبہ جامعہ بمبئی ، دہلی ، علیگڑھ

اِس کتاب کی اشاعت میں
مہاراشٹر اردو اکادمی کا جزوی مالی تعاون شامل ہے

پھوپو ماں

(عائشہ بی حاجی محمد ابراھیم جعفر)

کے نام

جن کی شامِ زندگی کی بے چہرگی،

میرے دل کو مفلس کا چراغ بنا دیتی ہے

یونس اگاسکر

ترتیب

میرا بن باس

'بے چہرہ شام' میری دوسری اُردو کتاب ہے جو پہلی کتاب کے دس سال سے بھی زیادہ عرصے
کے بعد منظرِ عام پر آ رہی ہے۔ ادب کا ایک ایسا خدمت گزار جو پاو صدی سے بھی زیادہ عرصے سے
مسلسل لکھتا پڑھتا رہا ہو اور تنقید و تحقیق، تاریخ و تہذیب اور سماجیات و لسانیات کے میدانوں میں
اشہبِ قلم کو دوڑاتے رہنے کے علاوہ مراٹھی زبان و ادب کا تعارف و ترجمہ بلا تکان اُردو والوں کے
سامنے پیش کرتا رہا ہو، ساتھ ہی افسانہ نگاری کی کیاری کو بھی روندتا رہا ہو اور طُرّہ یہ کہ جو برسوں اُردو
کے رسالے اڈٹ کر چکا ہو، وہ اپنی کتابوں کی اشاعت میں اس قدر پھسڈّی ثابت ہو کہ ایک کتاب سے
دوسری کتاب تک دس سال سے زیادہ عرصے کا وقفہ ہو جائے، ایک شرم ناک صورتِ حال ہے۔
لیکن اس کے لیے میں تنہا ذمّے دار نہیں ہوں۔ اس میں سب سے بڑا ہاتھ اس کارسازِ حقیقی کا ہے جس
نے نہ صرف میری بیوہ ماں کی حسرتوں اور جوان بھائی کی اُمنگوں کے جنازے میرے کاندھوں پر رکھ کر
میری دنیائے آرزو کو اُجاڑا، نیز میرے بزرگ رہنما مرحوم اعجاز صدّیقی کی ادبی سرپرستی سے مجھے محروم کیا،
بلکہ تھڑدلوں کو بالادستی اور اقتدار سے سرفراز کر کے اُنھیں حسد و رقابت کی دولت سے نوازا تاکہ وہ
ایک دل شکستہ کی راہ میں کانٹے بچھا سکیں، اُس کا ذہنی سکون برباد کرنے میں پورا زور لگا سکیں اور
اس کی زندگی کو جہنّم بنا سکیں۔

اس عرصے میں مجھ سے بھی ایک بھاری غلطی یہ ہوئی کہ میں نے ایک آستین کا سانپ پال لیا جو
غیروں کی بین پر تو خوب جھومتا ڈولتا تھا مگر مجھے لہرا لہرا کر ڈستا رہتا تھا۔ افسوس اُس کی اِس صفت کا

اندازہ مجھے بہت دیر میں ہوا۔ نتیجے میں اب تک میں اُس کے زہر کے اثر سے آزاد نہیں ہو سکا ہوں۔ شاید وہ بھی اپنی خو سے باز نہیں آسکا ہے۔ خُدا اُسے خوش رکھے۔

مہاراشٹر اُردو اکادمی نے اِس کتاب کی اشاعت میں مالی تعاون دیا ہے۔ اکادمی سے میرے تعلق کو "محبت و نفرت" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اکادمی کے قیام کے وقت اس کے بنیادی مقاصد میں اردو اور مراٹھی کے رشتے کی مضبوطی و اُستواری کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ اُس وقت بھی عزت مآب شنکر راؤ چوان جن کے ایما پر اکادمی کا قیام عمل میں آیا ہے، ریاست کے وزیر اعلا تھے اور اُن کی کابینہ کے ایک ممتاز وزیر محترم ڈاکٹر رفیق زکریا اُردو اکادمی کے چیرمین تھے۔ ان دونوں کی ذاتی دل چسپی اور خاص طور سے ڈاکٹر رفیق زکریا کی ہمت افزائی کے طفیل جب میری پہلی کتاب "مراٹھی ادب کا مطالعہ" اکادمی کے مالی تعاون سے منظرِ عام پر آئی تو اس کی بھرپور پذیرائی ہوئی۔ پھر یہ دونوں حضرات ریاستی حکومت اور اکادمی سے جُدا ہوئے اور اکادمی کی آنکھیں بھی بدل گئیں۔ چنانچہ جس فرد نے اردو اکادمی کے بنیادی مقصد کی سب سے پہلے تکمیل کی، اُس کو ہر طرح سے نظر انداز کیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ مراٹھی اور اردو کو قریب لانے کے سلسلے میں گذشتہ دس سال میں اُس سے کم تر خدمات انجام دینے والوں کو خصوصی انعامات کا مستحق سمجھا گیا اور بعض کو تو ایک سے زیادہ مرتبہ اِسی مد سے اور متعدد بار کسی نہ کسی عنوان سے نوازا گیا۔ سیمیناروں میں مقالہ پڑھنے کے نام پر ریوڑیاں بٹتی رہیں اور یونس اگاسکر لنگڑے پہلوان کی طرح اکھاڑے کے باہر سے تماشا دیکھتا رہا۔ ایک مرتبہ تو مجھے اطلاع دیے بغیر میرا نام ناگ پور کے ایک سیمینار کے شرکا میں شامل کر کے مشتہر کیا گیا اور میری رُسوائی کی گئی یا پھر کئی سال تک نظر انداز کرنے کے بعد پونا کے ایک سیمینار میں بُلایا بھی تو مقالہ پڑھوانے کے بعد معاوضہ و سفر خرچ دینے سے انکار کر کے تذلیل کرنے کے لیے۔

دوستو! مہاراشٹر اُردو اکادمی کی عنایتوں کا سلسلہ یوں ہی جاری رہتا اگر مہاراشٹر کی سیاسی کروٹ اکادمی کے رنگ روپ کو یکسر نہ بدل دیتی اور "بے چہرہ شام" بھی شاید اتنی جلدی منظرِ عام پر نہ آتی کیوں کہ اکادمی ہی کی اطلاع کے مطابق گذشتہ بورڈ نے اس کی اشاعت کی تجویز کو زیرِ غور لائے بغیر ہی بجٹ پاس کر دیا تھا اور اس کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی (جب کہ اکادمی کے ایما ہی پر اس سلسلے میں درخواست دی گئی تھی) مگر موجودہ نائب صدر اکادمی ڈاکٹر ظ انصاری

نے اکادمی کے بنیادی مقصد اور کتاب کی اہمیت کے احساس کے تحت گذشتہ بجٹ میں گنجائش پیدا کر کے پھول نہ سہی پھول کی پنکھڑی ہی سہی کے مصداق اسے اشاعتی امداد سے نوازا۔ میں اِس نوازش کے لیے اُن کا تہہِ دل سے ممنون ہوں۔

دوستو! ان ارضی، سماوی اور انسانی آفات کی محض جھلکیوں ہی سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میرے دس سالہ ادبی بن باس کے ذہنی، جذباتی و مالی اسباب کیا تھے۔ بن باس تو ختم ہوا مگر میری رام کہانی ختم نہیں ہوئی ہے، وقت اسے ابھی لکھ رہا ہے اور اس کا کلائمکس بھی ابھی دُور ہے اس لیے اس کی تفصیل سے گریز کرتا ہوں۔ اگر زمانے نے فرصت دی اور ضرورت محسوس ہوئی تو اس کی تکمیل میں اپنے ہاتھوں سے کروں گا اور آپ کو سناؤں گا۔ فی الحال اس کتاب پر توجہ ارزانی کیجیے۔

"بے چہرہ شام" مراٹھی کے نمائندہ افسانوں کا انتخاب ہے۔ یہ کہانیاں ۱۹۴۰ء سے ۱۹۷۰ء کی تین دہائیوں میں لکھی گئی ہیں اور مراٹھی میں 'نیا افسانہ' کے رجحان سے متعلق ہیں۔ ان میں سے کچھ کہانیاں اس سے قبل مختلف اُردو رسائل میں چھپ چکی ہیں اور کچھ پہلی مرتبہ اس کتاب کے ذریعے منظرِ عام پر آ رہی ہیں۔ اگر حالات نے ساتھ دیا تو اس کے بعد کی مراٹھی کہانی کا انتخاب یا انتخابات بھی پیش کرنے کی جسارت کروں گا۔

اِس کتاب میں ایک طویل مقدمہ بھی شامل ہے جس میں نئی مراٹھی کہانی کے آغاز وارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کی فنی اور نظری اساس سے اُردو والوں کو روشناس کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ اِس کے مطالعے سے اُردو والے اپنے افسانوں کے ادبی و فنی ارتقا کا موازنہ ہندوستان کی ایک ترقی یافتہ زبان کے افسانوں کے معیار سے کر سکیں گے۔ اسی خواہش کے پیشِ نظر کہیں کہیں اردو اور مراٹھی افسانے کے تقابل کی کوشش بھی کی گئی ہے۔

محترم ہمت رائے شرما، میرے بزرگ دوست اور بے غرض خیر خواہ ہیں۔ انھیں جب پتا چلا کہ میں مراٹھی افسانوں کے تراجم کا مجموعہ چھپوا رہا ہوں تو نہ صرف پُرخلوص مسرت کا اظہار کیا، بلکہ اس کتاب کا سرورق بنانے پر بھی اپنی فوری رضامندی ظاہر کی۔ اُن کے حُسنِ خیال اور حُسنِ عمل نے "بے چہرہ شام" کے سرورق میں جان ڈال دی ہے۔ اس کرمِ خاص کے لیے اُن کا شکریہ ادا کرنے لایق الفاظ میرے ذخیرے میں نہیں ہیں۔ خدا اُنھیں ہزاری عمر سے نوازے۔

اس کتاب کی تیاری واشاعت میں میرے دوست جناب انجم عباسی اور عزیز شاگرد جناب الیاس شوقی کے مشورے اور عملی تعاون شامل رہا ہے۔ میں ان دونوں کا شکریہ ادا کرنا اپنا خوشگوار فرض سمجھتا ہوں۔ ساتھ ہی اُن تمام افسانہ نگاروں یا اُن کے وارثوں کا ممنون ہوں جن کی اجازت سے یہ تراجم شایع ہو رہے ہیں۔

شعبۂ اردو، جامعہ بمبئی
ودیانگری، بمبئی ۴۰۰۰۹۸

یونس اگاسکر
یوم آزادی ۸۷ء

مراٹھی نیا افسانہ : آغاز و ارتقا

(مقدّمہ)

مراٹھی میں نیا افسانہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد منظرِ عام پر آیا۔ دوسری عالمگیر جنگ نے ساری دنیا میں نظریاتی ہلچل اور جذباتی بے چینی پیدا کر دی تھی۔ انسان کو اپنی کم مائیگی، تحفّظ کی کمی، آدرشوں کے زوال اور حقیقتوں کے چومکھی ہونے کا احساس شدّت سے ہونے لگا تھا۔ ادب و شعر کے بندھے ٹکے تصوّرات بھی دم توڑ رہے تھے۔ ہر چیز کے تغیّر پذیر ہونے کا تجربہ ذہنی و جذباتی انتشار پیدا کر رہا تھا۔ ایسے میں مُروّج سانچوں میں ڈھلی ہوئی ہیئت، آغاز، درمیان اور انجام کی تپائی پر ٹکی ہوئی تکنیک اور فرائڈ و مارکس، جمالیت پسندی و حقیقت نگاری اور ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کے تصوّرات سے متاثر مواد و اسلوب کو سینے سے لگائے ہوئے ادبی تخلیق کرتے رہنا نئے فن کاروں کے لیے اپنا اعتبار کھو دینے کے برابر ہو گیا۔

ایک طرف بال سیتارام مرڈھیکر، ایک نقاد اور شاعر کی حیثیت سے مراٹھی شاعری کے تنِ نیم مُردہ میں نئے تصورات و تجربات کی رُوح پھونک رہے تھے۔ اُن کی تنقیدوں نے ادب کے روایتی مقاصد اور مناصب کی جڑوں پر حملہ کر دیا اور اُن کی شاعری نے نئی کوتا کو جنم دیا۔ "آرٹس اینڈ مین" (انگریزی) اور "فن اور ادب" (مراٹھی) میں اُنھوں نے نئے جمالیاتی تصورات پیش کیے اور اُن کی روشنی میں ادب و شعر کی قدر و قیمت متعین کی۔ مغربی ادب سے متاثر کچھ نوجوانوں نے مرڈھیکر کے خیالات اور اُن کی تحریروں کو پڑھ کر افسانے کے میدان میں بھی تجربات کرنے شروع کر دیے جن کے نتیجے میں روایتی افسانے کا فن تقریباً بالائے طاق پہنچ گیا اور مراٹھی میں نئے افسانے کی بنیاد پڑی۔

ان نئے لکھنے والوں میں گنگادھر گاڈگل، اروند گوکھلے، پرشوتم بھاسکر بھاوے اور وینکٹیش ماڈگول کر سب سے پیش پیش رہے۔ ان کے علاوہ سدانند ریگے، دیناینشور ناڈکرنی اور جی۔ اے۔ کلکرنی نے اِس روایت کو پروان چڑھانے میں خاص طور سے ہاتھ بٹایا۔

مراٹھی میں افسانے کی تاریخ ادبی رسالوں کی تاریخ سے جُڑی ہوئی ہے (اِسی لیے افسانے کے ارتقائی اَدوار مقرّر کرتے وقت اُنھیں بعض مشہور رسالوں کے اجرا و اختتام کے دَور سے منسوب کیا گیا ہے) مراٹھی کا نیا افسانہ بھی بعض اہم رسالوں کی مدد اور توسط ہی سے پر پُرزے نکال سکا اور پنپ سکا۔ نئے مراٹھی افسانے کو پروان چڑھانے میں سمپکشک، اَبھی رُچی، ساہتیہ اور ستیّہ کتھا اِن رسالوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اِن پرچوں نے دقیانوسی خیالات کو دھکّا پہنچانے والے اور روایتی اخلاقیات کو جھنجھوڑ دینے والے افسانے چھاپے، تنقیدی مضامین شایع کیے اور ادبی مباحث کو اپنے صفحات پر جگہ دی۔ زندگی کی طرف سنجیدگی سے دیکھنے پر بزرگ افسانہ نگاروں کو آمادہ کیا اور ادب کو محض تفریح کا ذریعہ، حصولِ مسرّت کا وسیلہ، ایک مشغلہ اور کاریگری و ہنرمندی سمجھنے والوں کو اُس کے پسِ پُشت سنجیدہ مقصد اور high seriousness کی ضرورت کا احساس دلایا اور ساتھ ہی ساتھ پُرانے سانچوں کو توڑنے پھوڑنے میں افسانہ نگاروں کی مدد بھی کی۔ نتیجے میں ہر افسانہ نگار کے موضوع اور شدّتِ احساس کے مطابق اُس کے افسانے کی تکنیک جنم لینے لگی۔ یہ تصور عام ہو گیا کہ ہر تخلیق اپنی ہیئت اپنے ساتھ لاتی ہے۔ تکنیک کو نیا موڑ دینے میں شعور کی رَو مددگار ثابت ہونے لگی۔ کردار سازی میں نفسیاتی دروُں بینی عام ہوتی چلی گئی۔ آدرش واد پر سے ایمان اُٹھتا گیا، اخلاق دیمک زدہ اور انسان کرم خوردہ نظر آنے لگے؛ شاعری کی طرح افسانوں میں بھی تمثیل اور اِمیجری سے کام لیا جانے لگا، ابہام پسندی اور تجریدیت کے استعمال نے ترسیل و ابلاغ کے مسائل کھڑے کر دیے؛ نفسیاتی تجزیے کے ساتھ جنس کی تحلیلِ نفسی نے عُریانیت کے دروازے بھی کھول دیے۔ غرض کہ افسانہ نگاروں نے اِس نئی رَو کے ساتھ چل کر مراٹھی میں ایسے نئے افسانے کو جنم دیا جس میں مُثبت اور منفی پہلو فن کو گھیرے رہے اور ۱۹۵۰ء تک یہ واضح نہ ہو سکا کہ جدیدیت کا یہ رُجحان مراٹھی افسانے کی کیا خدمت انجام دے رہا ہے۔

اِبتدا میں نئی کہانی کا تجزیہ کرنے والے کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ آیا اُسے

مختصر افسانے ہی کا ترقی یافتہ روپ سمجھا جائے یا ایک آزادانہ صنف کی حیثیت دی جائے۔ دوسرا مسئلہ یہ کھڑا ہو گیا کہ اسے حقیقت پسندانہ کہا جائے یا ہنرمندانہ اور تجرباتی قرار دیا جائے۔ اس کے خواص اور خصوصیات کا تعین بھی ضروری ہو گیا تاکہ اُسے شناخت اور انفرادیت حاصل ہو سکے۔ نئی کہانی کے ایک اہم ستون گنگا دھر گاڈگل نے اپنے ایک افسانوی مجموعے "چٹان اور پانی" کے دیباچے میں نئی کہانی کو پُرانی کہانی کے دایرے کے پاس کھینچا ہوا ایک چھوٹا سا دایرہ سمجھنے سے صاف انکار کرتے ہوئے اُسے پہلے سے بڑا دایرہ قرار دیا جس کے اندر پُرانی اور روایتی کہانی کا دایرہ بھی سمویا ہوا ہے اور چونکہ یہ پُرانا دایرہ غلط مرکز کے گرد کھینچا ہوا تھا اس لیے اُسے اِس نئے وسیع دایرے کے ایک کونے میں جگہ دینے پر اصرار کیا۔

روایتی کہانی کے دایرے کو محیط اس نئے دایرے میں سمائے ہوئے نئے افسانے پر ہیئت، مواد، اسلوب، نظریاتی پس منظر اور جدید حسیت کے زاویہ ہائے نظر سے غور کیا جائے تو سب سے پہلے اس کا روپ ہمیں متوجہ کرتا ہے جو مختصر افسانے کی ترقی یافتہ شکل کے بجائے ارتقائی صورت ہے۔ اس کا رنگ روپ زمانی اعتبار سے نہیں، مزاج و منصب کے اعتبار سے جدید ہے۔ اس میں وسیع تر تجرباتی دنیا ہے، لاشعوری مسائل کی پیشکش ہے اور اس پیشکش کے سلسلے میں مستعمل اسلوب اور الفاظ و تراکیب کی چُستی و موزونی سے منحرف زبان ہے اور سب سے اہم بندھے ٹکے سانچے کو توڑنے والی وہ تکنیک ہے جو اِس کہانی کو پُرانی کہانی سے الگ کرتی ہے۔ اس میں مواد اور اس کی پیشکش کے نئے پن کے سبب ایک قسم کا اِبہام بھی ملتا ہے جو بیانیہ انداز کی کہانیوں میں مفقود تھا۔ نئی کہانی کا اسلوب اس اعتبار سے نیا تھا کہ اس کا مقصد محض انسان یا اشیا کے بیرونی مظاہر کا بیان کرنا نہیں تھا بلکہ فن کار کے دل و دماغ پر ان سے مرتب ہونے والے اثرات کو قاری تک پہنچانا اس کا مطمحِ نظر تھا اور اِس مقصد کے حصول کے لیے اِمیجری کا استعمال اُسے ناگزیر معلوم ہوا۔

نئے افسانے میں عام انسانی جبلتوں اور خواہشوں پر ماحول کی لگائی ہوئی پابندیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سنگھرش کو اشارتی انداز میں برتا گیا، اِس طرح مراٹھی نئی کہانی دروں بینی کی طرف مائل ہوتی چلی گئی۔ خاص طور سے گنگا دھر گاڈگل، اروند گوکھلے اور وامن چورگھڑے نے

تحلیل نفسی کے ذریعے اِسے انسانی لاشعور کے تاریک جنگلوں کی سیر کرادی اور اس سلسلے میں معصوماً اخلاقی سانچوں اور فحاشی و عریانی سے متعلق روایتی تصورات کی پروا نہیں کی۔

مراٹھی کے نئے افسانے میں پلاٹ اور سلسلۂ واقعات کے منطقی ارتقا پر بھی توجہ نہیں دی گئی۔ بلکہ اسے اراداتاً نظر انداز کیا گیا تاکہ کہانی پن سے زیادہ کہانی کے تاثر کو اُجاگر کیا جاسکے۔ یہاں نفسیاتی ردِّ عمل اور خیالِ محسوس (felt thought) کو زیادہ اہمیت حاصل ہے اور منطقی اخذِ نتیجہ کو بہت کم۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں ڈرامائی تاثر انگیزی بھی بہت کم ملتی ہے اور تجسّس کو بڑھاوا دینے کے بجائے فکر کو تحریک دینے کی کوشش نظر آتی ہے۔ اس میں افراد کے درمیان کشمکش کا فقدان ہے لیکن فرد اور سماج اور فرد کے شعور و لاشعور کے درمیان سنگھرش کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ دراصل تحلیل نفسی نئے افسانے کی سب سے اہم خصوصیت ہے اور اس میں حالت اور موڈ کو واقعات پر تفوق حاصل ہے۔

ادب میں کسی رجحان یا تحریک کا آغاز کسی ایک تخلیق یا تحریر کا مرہونِ منت نہیں ہوتا لیکن تاریخی تسلسل اور ارتقائی منازل کا جایزہ لینے کے لیے بعض ابتدائی کاموں اور تحریروں کا تذکرہ ضروری ہوتا ہے۔ یہاں نئی مراٹھی کہانی سے متعلق تاریخی تفصیل کی نہ گنجائش ہے اور نہ ضرورت۔ لیکن اِس رجحان کے آغاز اور اِس نہایت اہم ادبی موڑ کی نشان دہی کرنے کے لیے بعض افسانہ نگاروں اور اُن کی تخلیقات کا تذکرہ ناگزیر ہے:

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں مراٹھی کے نئے افسانے کا آغاز گنگادھر گاڈگل سے ہوتا ہے جن کی پہلی کہانی "محبوبہ اور بلّی" ۱۹۴۰ء میں شایع ہوئی اور پہلا افسانوی مجموعہ "نفسی تصویریں" ۱۹۴۶ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اِس میں مصنّف نے جذباتیت اور ایک خوابناک زاویۂ نگاہ کے باوجود مروّج تکنیک کو ٹھکرا کر کہانی کا نیا منظر نامہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد دو افسانوی مجموعوں "کچھ تلخ کچھ شیریں" (۱۹۴۸ء) اور "نئی راہیں" (۱۹۵۰ء) کے ذریعے انھوں نے نئے افسانے کے سارے پہلو اُجاگر کر دیے۔ گاڈگل نے پہلی مرتبہ واقعات سے زیادہ نفسیاتی اُلجھنوں کو اہمیت دی اور سماج میں انسان کے misfit ہونے کو اُس کی ناآسودگی اور کشمکش کا بنیادی سبب بتایا۔ "خالی بس"، "اُبل جانے والا دودھ"، "تھکن"، "کرم خوردہ لوگ"، "بے چہرہ شام" اُن کے

وہ مشہور افسانے ہیں جن سے نیا افسانہ اپنی شناخت متعین اور مکمل کرتا ہے۔ گاڈگل کی کہانیوں میں زندگی کی بے معنویت، بے رحمی اور بے سمتی نمایاں ہے۔ وہ اداس اور تنہا رُوحوں کے ترجمان ہیں۔ انسانی رشتوں میں انھوں نے خاص دلچسپی لی ہے اور بے رحم حقیقت پسندی کے ساتھ اُن پر اپنے قلم کی مدد سے عمل جراحی کیا ہے اور ان کے معنی تلاش کیے ہیں۔ ان کا مشہور افسانہ "کچھ تلخ کچھ شیریں" متوسط طبقے کے ایک خاندان کی روزمرّہ کی زندگی کا کٹھور نفسیاتی مطالعہ ہے جسے افسانے ہی کے ایک نسوانی کردار کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ اسے گاڈگل کے طرزِ تحریر، اندازِ فکر اور افسانوی جی نی ایس کا اعلا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

گاڈگل کا ایک اور افسانہ "کرم خوردہ لوگ" متوسط طبقے کے ملازمت پیشہ افراد کی نفسیاتی عکاسی ہے۔ اِس گروہ کی دکھاوے کی شرافت کی چادر کے نیچے چھپی ہوئی ہوس اور بے ایمانی کو مصنّف نے سعادت حسن منٹو کی طرح بڑی صفائی سے بے نقاب کیا ہے۔ اِس کہانی کا پس منظر فسادات ہیں۔ گاڈگل نے افسانے کی ابتدا میں کھٹملوں کی چال میں رہنے والے کرداروں کا تعارف پیش کیا ہے۔ یہ سارے "کرم خوردہ لوگ" اس وقت گیلری میں جمع ہو جاتے ہیں جب چند غنڈے ایک جوتوں کی دکان کا تالا توڑ کر سامان لوٹنے میں مصروف ہیں۔ ان تماشا دیکھنے والوں میں بنڈو پنت ہیں جو اِس موقع کا فایدہ اُٹھاتے ہوئے پڑوسن مالتی بائی کو دھکا مارتے ہیں، ایک نو بیاہتا جوڑا ہے جو سب کو دکھانے کے لیے چونچلے بازی کرتا ہے، گھارو انا ہیں جو لوٹی جانے والی دکان سے جُوتوں کی جوڑی چُرا لانے پر اپنے لڑکے دامُو کو بُرا بھلا کہنے کے بعد کمرے میں جاکر جوتوں کا ناپ دیکھنے لگتے ہیں۔ دامُو پہلی مرتبہ کامیاب ہونے کے بعد دوسری مرتبہ پھر نیچے اُترتا ہے اُس وقت کا منظر ملاحظہ ہو:

> "جس وقت دامُو نیچے گیا، لوٹ کھسوٹ شدت اختیار کر چکی تھی۔ سارے لوگ ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے، چلّا رہے تھے، جھگڑ رہے تھے، مار پیٹ کر رہے تھے اور ہنس بھی رہے تھے۔
>
> اِس ہنگامے میں دانستہ پھنسی ہوئی ایک بڑھیا دب کر بالکل چپٹی ہوئی جا رہی تھی اور چیخ رہی تھی۔ ہر آدمی چلّا رہا تھا "ارے، ارے، اِس بڑھیا کو بچاؤ"۔ لیکن

کوئی دھکم پیل روکنے کو تیار نہ تھا۔

اِس دنگے میں بھی داموٗ نے جلدی سے اپنی تھیلی بھرلی اور واپس مُڑا، اتنے میں ایک کرٹیل غنڈے نے اُس کے ہاتھوں سے تھیلی چھین لی اور آگے چلنے لگا۔ داموٗ اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے چلانے لگا۔ "یہ کیا؟ یہ کیا؟"

یہ سُن کر وہ موالی پیچھے مُڑا اور اُس نے داموٗ کے مُنہ پر چٹاخ سے ایک طمانچہ جڑ دیا داموٗ کی ساری کنپٹی لال ہو گئی، اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس کا سر گھومنے لگا۔

جیسے تیسے گھر پہنچ کر اُس نے جب ساری واردات سُنائی تو تھیلی کھو دینے کے جُرم میں گھار وٗانا نے اُسے خوب ڈانٹا پھٹکارا۔"

گاڈگل بُنیادی طور پر اجتماع کے عکاس فن کار ہیں، وہ اپنے افسانوں میں زیادہ تر گروہ کی نفسیات پیش کرتے ہیں اور اُن کے باہمی رشتوں کی تحلیل و توضیح کرتے ہیں۔ ان کے مرکزی کردار فرد سے زیادہ افراد کا مجموعہ جیسے خاندان، گھر، اسکول، سڑک اور شہر ہوتے ہیں۔ فرد کے توسط سے بھی وہ گروہ یا جماعت کی ذہنی و جذباتی کشمکش یا ردِ عمل کو پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ اُن کا ایک مشہور افسانہ "بے چہرہ شام" اُن کے فن کارانہ رویے کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ بمبئی کی چہل پہل اور بھاگ دوڑ سے بھری شام اُنھیں اداس، ملول اور بے چہرہ نظر آتی ہے کیوں کہ صنعتی ترقی اور شہری آبادی نے انسانوں سے ان کا تشخص چھین لیا ہے۔ وہ مشینوں اور گاڑیوں کی طرح غیر ذی رُوح لگنے لگے ہیں اور اُن کے ردِ عمل بھی میکانکی اور جذبات سے عاری ہو گئے ہیں۔ شہری ماحول میں انسانی زندگی کی بے معنویت پر گاڈگل کی کہانی "بے چہرہ شام" مراٹھی کے نئے افسانے کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور جب ہم یہ سوچنے لگتے ہیں کہ یہ کہانی آج سے پینتیس ۳۵ سال قبل لکھی گئی تھی تو مراٹھی افسانے اور گنگا دھر گاڈگل کے فن کی پیش روی پر تعجب ہونے لگتا ہے۔

نئے افسانے کے دوسرے اہم خالق اروند گو کھلے ہیں جن کی کہانیوں میں گاڈگل کے افسانوں کی طرح سلسلۂ واقعات یا کہانی پن مفقود نہیں ہوتا۔ نہ ہی وہ انسان کی فطری اچھائیوں سے

جنھیں صنعتیاوے (industrialization) نے کچل کر رکھ دیا ہے، اس قدر مایوس ہیں۔
اروند گوکھلے کا پہلا مجموعہ "نذرانہ" ۱۹۴۴ء میں منظر عام پر آیا جس پر روایتی کہانی کے تکنیکی دروبست، پلاٹ کے دل چسپ آغاز اور موثر انجام اور رومانی زاویۂ نگاہ کی گرفت نظر آتی ہے لیکن جلد ہی گوکھلے نے اپنے فن کو روایتی جکڑ بندیوں سے آزاد کرلیا اور کرداروں کے نفسیاتی مطالعے اور زندگی کے چونکا دینے والے پہلوؤں کی پیشکش کے ذریعے اُسے ایک انفرادیت بخشی۔

اروند گوکھلے نے جس کہانی کے ساتھ نئے افسانے کے میدان میں قدم رکھا وہ ۱۹۴۵ء کے "ستیہ کتھا" میں چھپی تھی "ایک میمنے کی کہانی"۔ اس میں انھوں نے فوج سے بھاگے ہوئے ایک رنگروٹ کے توسط سے جنگ کی ہولناکی، اس کی بے معنویت اور انسانی زندگی کی بے قدری کا نقشا کھینچا ہے۔ اس کہانی میں بیان کا دل چسپ تجربہ یہ ہے کہ شروع سے آخر تک ایک غم ناک سُر کے جاری رہنے کا احساس ہوتا ہے اور تکنیک کے اعتبار سے آغاز وانجام ایک ہی قسم کے ذہنی تناؤ اور بکھراو کو پیش کرتے ہیں۔ گویا یہ افسانہ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے کے عالمی اور خاص طور سے ہندوستان گیر نفسیاتی ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔

اروند گوکھلے کے افسانوں کی ایک اور اہم خصوصیت ان کی موت سے متعلق گہری دل چسپی ہے۔ وہ موت کو ایک بھیانک اور قابلِ نفرت حقیقت کے روپ میں پیش کرنے کے بجائے اس پر فلسفیانہ انداز سے غور و فکر کرتے ہیں اور کبھی نجات دہندہ، کبھی سکون بخش رفیق اور کبھی گمراہیوں سے بچانے والی رہنما کے طور پر اس کا استقبال کرتے ہیں۔ غالباً گوکھلے پہلے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اپنے افسانوں میں موت کو اتنے پیار سے گلے لگایا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی کہانیاں "یاترا" "برہنہ بارِ رُوح" "دیپ دان" "بلاوا" "چھلانگ" اور "ساری زندگی" خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے سماج کے استحصال زدہ طبقوں خاص طور سے طوائف کو موضوع بنا کر مراٹھی افسانے کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا ہے۔ اروند گوکھلے کے فن کی قوت، اُن کی انسان دوستی اور دل کو چھو لینے والی نثر میں پوشیدہ ہے۔ ان کے اکثر کردار اُن کی دنیائے تجربات و مشاہدات سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے سامنے دل کھول کر رکھ دینے کے بعد ہی اُن کے افسانوی دالان میں قدم رکھ پاتے ہیں۔ اس لیے اُن کا ہر لفظ اور اُن کی ہر حرکت اُن کی زندگی کی سچی تصویر کشی کرتی ہے۔ اس میں نسوانی کرداروں کی کثرت کے باوجود تنوع اور رنگا رنگی ملتی ہے۔ اُن کا ایک نسوانی کردار

منجولا (کہانی منجولا) صنعتی سماج میں مرد و عورت کے رشتے کو میکانکی اور حیوانی بننے سے روکنے کی کوشش میں تڑپتی اور چھٹپٹاتی عورت کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ گوکھلے کی یہ کہانی اس موضوع پر ایک شاہ کار کا درجہ رکھتی ہے۔ 'منجولا' کے ذریعے گوکھلے کو نہ صرف مراٹھی میں بلکہ ہندوستان اور بیرونِ ہند کے جدید کہانی کاروں کے زمرے میں نمایاں مقام حاصل ہوا ہے۔ انگریزی کے علاوہ یورپ کی کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ جدید مراٹھی افسانے میں 'منجولا' کو نئی سوچ کا نقطۂ آغاز سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان کی جدید عورت جو مرد کے شانہ بشانہ زندگی کے میدان میں جدوجہد کر رہی ہے، شہروں کی میکانکی زندگی کے باعث اپنے گھر اور اپنے بستر کو بھی بے روح میکانکیت سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ وہ بغاوت کرنا چاہتی ہے لیکن اس کی سماجی حیثیت، مرد کا عدم تعاون اور اس کا اپنا احساسِ فرض سب آڑے آتے ہیں۔ مرد کا جنسی تعاون اسے حاصل ہو تو وہ اپنی محرومی کو کامرانی میں بدل سکتی ہے۔ وہ مرد سے کیا چاہتی ہے؟ اس کا جواب منجولا کی زبان سے گوکھلے نے اس کہانی میں دیا ہے۔ وہ اپنے شوہر کے جنسی تقاضے کا جواب نہ دے پانے پر کہتی ہے:

"چاروں طرف یہ عمل نفرت انگیز روپ اختیار کرتا جا رہا ہے، حیوانوں کی طرح۔ لیکن مجھے حیوان نہیں بننا ہے۔ میں اپنے جذبات، اپنی خواہشات کی حفاظت کرتی ہوں، انہیں پوتر مانتی ہوں۔ کم از کم اس تحفظ سے تو مجھے محروم نہ کرو۔ مجھے بے عزت نہ کرو، شرد، مجھے بے عزت نہ کرو۔"

نئے افسانے کے ایک اور روایت ساز خالق وینکٹیش ماڈگول کر ہیں جنھوں نے پہلی مرتبہ دیہی سماج اور کرداروں کو اپنے افسانوں میں دیہی زبان میں اور مقامی بولی کے استعمال کے ساتھ پیش کیا۔ ماڈگل کر کے افسانوں میں دیہی سماج اپنی ساری جزئیات کے ساتھ جلوہ گر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ ان کا بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے کرداروں کو مقصدیت کی عینک سے دیکھنے اور ان کے توسط سے کسی خاص زاویۂ نگاہ کی ترسیل کرنے کے بجائے ان کے اصلی روپ میں پیش کیا ہے اور ان کی سماجی توجیہہ کی کوشش نہیں کی ہے۔ یہ خصوصیت بذاتِ خود روایتی کہانی سے بغاوت کے مترادف ہے۔

ان کا پہلا مجموعہ "مان دیس کے لوگ" ۱۹۴۹ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد گاؤں کے افسانے" (۱۹۵۱ء)" کالی ماں" (۱۹۵۳ء) "دہلیز" (۱۹۶۰ء) اور دیگر مجموعوں میں شامل اکثر کہانیوں میں

انھوں نے مسلسل دیہی سماج کی بھرپور عکاسی کی ہے اور اس ملک کی صدیوں پرانی دیہی معیشت و ثقافت اور افلاس کا بے میل نقشا کھینچا ہے جسے دیکھ کر دل پر چوٹ لگتی ہے اور انسان بلا ارادہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ماڈگولکر کے کرداروں نے مل کر اُن کے افسانوی ادب کو دیہی تصاویر کی گیلری کا رُوپ دے دیا ہے۔ کردار سازی، مواد، طرزِ بیان، مکالمہ، ماحول اور فن کارانہ معروضیت کے اعتبار سے وینکٹیش ماڈگولکر کے افسانے نئی کہانی کے باب کی تکمیل کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا افسانہ نگاروں کے مقابلے میں پُ، بھا، بھاوے اِس اعتبار سے مختلف ہیں کہ ان کے ہاں رومانیت کے ساتھ مقصدیت اور آدرش واد ملتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر حُسن پرست ہیں۔ اور زندگی کے حسین پہلوؤں کے عاشق ہیں۔ اس لیے انسانوں میں جسمانی، اخلاقی و رُوحانی حُسن کی تلاش اُن کا اوّلین مقصد ہے۔ اُنھیں جہاں حیوانیت، دوغلاپن اور استحصال نظر آتا ہے وہاں اُن کے قلم کی دھار تیز ہو جاتی ہے۔ وہ زندگی کے بارے میں حقیقت پسندانہ انداز رکھنے کے باوجود آدرش واد اور رومانویت کے زیرِ اثر حقیقت نگاری سے دُور بھی چلے جاتے ہیں اور آئیڈیل ازم کا شکار ہو کر جو ہے اُسے پیش کرنے کے بجائے جو ہونا چاہیے اس کی پذیرائی شروع کر دیتے ہیں۔ میں انھیں ذاتی طور پر کرشن چندر کے قبیل کا افسانہ نگار سمجھتا ہوں، حالانکہ دونوں کے نظریات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کرشن چندر اشتراکی ہیں تو بھاوے ھندوُ راشٹر وادی، لیکن دونوں کے مزاج کی رومانویت اور آدرش واد اُنھیں افسانہ نگار کی حیثیت سے ایک دوسرے کے قریب لے آتا ہے۔

بھاوے کو جذبۂ محبت کی پیشکش میں اوروں سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ انھوں نے مختلف عمر کے مرد و عورت کے جذباتِ عشق کی عکاسی بڑی کامیابی سے کی ہے۔ گنگا دھر گاڈگل کا خیال ہے کہ "بھاوے کی سب سے عمدہ کہانیاں محبت کی کہانیاں ہیں اور اتنی حسین پریم کتھائیں انگریزی میں بھی شاذ ہی ملتی ہیں" (پٹھان اور پانی)۔ بھاوے کے افسانوں میں محبت کا تصوّر یا جذبہ الوہی یا Platonic نہیں ہے، وہ قطعی ارضی و جنسی ہے لیکن بھاوے نے اُسے جنس زدہ یا ہوس پرستانہ نہیں بنایا ہے۔ وہ جنس کو نہ تو مقدس بنا کر پیش کرتے ہیں اور نہ ہی اُسے حیوانی رُوپ دیتے ہیں۔ اُن کے ہاں جنس کا تصوّر قطعی انسانی اور فطری ہے۔ گاڈگل نے بھی جنس کو برتا ہے مگر وہ کہیں کہیں اپنے موضوع کو منٹو کی طرح اِس قدر قریب سے دیکھتے ہیں کہ وہ مسخ

ہو جاتا ہے اور ان کا انداز پیشکش crude معلوم ہوتے لگتا ہے جبکہ بھاوے اپنے انداز بیان کے حُسن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور ایک فاصلہ برقرار رکھتے ہیں چاہے اس کوشش میں حقیقت نگاری سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونا پڑے۔ بھاوے کی عمدہ کہانیوں میں "سترہواں سال" "سنسکار" "سگندھ" "موہ" خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ بھاوے کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "پہلی بارش" ۱۹۴۶ء میں منظرِ عام پر آیا تھا۔

مذکورۂ بالا کہانی کاروں کے علاوہ جن فن کاروں نے اِس صنف کو پروان چڑھانے میں قدامت اور جدّت کے فرق سے بے نیاز ہو کر حصّہ لیا ہے اُن میں نارائن گنیش گورے، مدھو منگیش کرنِک اور شَن۔ نا۔ نوَرے میرے نزدیک خاصے اہم ہیں۔ یہ تینوں افسانہ نگار بہ اعتبارِ تخلیق اور اندازِ تحریر کے اعتبار سے نئی کہانی کے دَور سے متعلق فن کار ہیں۔ اِنھوں نے ہیئت اور مواد کے گوناگوں تجربے تو نہیں کیے مگر کہانی کو فرسودہ موضوعات اور مسائل سے ہٹا کر اس کا جدید روپ نکھارنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔

اِن میں نارائن گنیش گورے ایک بزرگ سماج وادی رہنما ہیں، اِس لیے ان کے افسانوں میں ہندوستان کے نئے اُبھرتے ہوئے سماج اور اس کے سیاسی، معاشرتی اور جنسی مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اُن کی کہانی سماجی تفکّر اور سیاسی سوچ سے متاثر ہوتی ہے۔ "آہیں" اُن کی نمائندہ کہانی ہے۔ اُن کے انشائیوں اور افسانوں کا مجموعہ "ڈالی" بہت مشہور ہے۔

مدھو منگیش کرنِک نے کوکن کے پس ماندہ علاقوں کے معاشی و معاشرتی مسائل کی بھرپور نمائندگی کی ہے۔ اُنھیں علاقائی زبان اور دیہی سماج کی عکاسی پر غیر معمولی عبور حاصل ہے۔ وہ زیادہ تر پسے ہوئے طبقے کی اُمنگوں اور حسرتوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ 'دھرم' اور 'پڑاو' میں انھوں نے اپنے انفرادی اسلوب اور رنگ کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔

شَن۔ نا۔ نوَرے زیادہ تر زندگی کے اُس پہلو کو پیش کرتے ہیں جسے Paradox یا حالات کی ستم ظریفی سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ اُن کے کردار زیادہ تر وقت کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر اُبھرتے ہیں اور پڑھنے والے کے لیے سوالیہ نشان چھوڑ کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ اُن کے موضوعات کی طرح اُن کی تشبیہات بھی ماحول کی آئرنی (irony) کو پیش کرتی ہیں۔ اُن کی دو کہانیاں

'اِس میلے میں' اور 'روٹی کا جادو' اُن کے تیکھے مگر ہمدردانہ اسلوب کی نمائندگی کرتی ہیں۔

گاڈگل، گوکھلے، بھاوے اور ماڈگول کر نے اپنے اپنے ڈھنگ سے نئی مراٹھی کہانی کی شناخت متعین کی، اس کے رنگ روپ کو نکھارا، اس کے اُفق روشن کیے، مواد اور تکنیک کے تجربے کر کے کہانی کے امکانات کو وسیع کیا اور اُسے پُرانے پن کے ٹھوس معیارات سے آزاد کیا۔ نتیجے میں سانچے میں ڈھلی ہوئی کہانی سیاّل اور تغیر پذیر ہوتی چلی گئی۔ اس میں اجتماعی وانفرادی نفسیات کے مطالعے کے ساتھ ساتھ سیاسی، معاشرتی واقتصادی مسائل کی فن کارانہ موشگافیاں کی جانے لگیں، کہانی پن کم ہوتا چلا گیا اور تاثراتی تجزیہ زیادہ سے زیادہ جگہ پانے لگا۔ نئی کہانی کے مذکورہ بالا چار ستونوں کے علاوہ جن کتھا کاروں نے اس عمارت کے دریچے اور محرابیں سجائی ہیں اُن میں سدانند ریگے، گیانیشور ناڈکرنی، جی۔اے۔ کلکرنی اپنے انفرادی رنگ کی وجہ سے خاصے نمایاں ہیں۔ ان میں جی اے کلکرنی کی کہانی اس حد تک مختلف اور متنوع ہے کہ اسے مراٹھی کی نئی کہانی کے رجحان سے الگ ۱۹۶۰ء کے بعد کی مراٹھی کہانی میں شامل کیا جاتا ہے اور انھیں ایک نئے رجحان کا علمبردار سمجھا جاتا ہے۔ یہ لوگ گاڈگل کے فن کو مزید پروان چڑھانے والے کہانی کار ہیں۔

جن کہانی کاروں نے بھاوے کے انداز میں کہانیاں لکھنے سے اپنے فن کی شروعات کی اور آگے چل کر نئی کہانی کو نئی دِشاؤں سے روشناس کرایا اُن میں وسُندھرا پٹّے وردھن، شانتا رام، سری ج۔ جوشی اور دِ۔ با۔ موکاشی اہم ہیں۔

ماڈگول کر کی حقیقت پسندانہ دیہی عکاسی سے متاثر ہو کر اسے نئی منزلیں سر کرانے والے کہانی کاروں میں شنکر پاٹیل، د۔ ما۔ مراسدار، اُدھو شیلکے، شنکر راؤ کھرات، انا بھاؤ ساٹھے، رنجیت دیسائی اور آنند یادو نمایاں ہیں۔ ان میں انا بھاؤ ساٹھے اور آنند یادو کی کہانی آج کی دلت کہانی سے جُڑی ہوئی ہے۔

مراٹھی میں نئی اور پُرانی کہانی کے دھارے ساتھ ساتھ بہتے رہے اور ۱۹۶۰ء تک قدامت اور جدت کے رنگ الگ الگ پہچانے جاتے رہے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد مراٹھی کہانی نے ایسی کروٹ لی کہ نئے اور پُرانے کی حدبندیاں ختم ہو گئیں یا یوں کہیے کہ پُرانی اور نئی کہانی کی شناخت ختم ہو کر نئے ڈھنگ کی کہانی سامنے آئی جسے "آج کی کہانی" کہا گیا۔ 'آج کی کہانی' کے علم برداروں میں جی اے کلکرنی

کمل دیسائی، دلیپ چترے، چھ[illegible] تریم۔ کھانولکر، وجیا راجادھیکش، وجے تینڈولکر، بابو راو باگل، جیونت دلوی، سدانند [illegible]ئے وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ "نیا افسانہ" کے کارواں میں بھی شامل رہے ہیں۔ لیکن جس طرح اردو میں ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود کچھ لکھنے والوں نے ۱۹۶۰ء کے آس پاس (اور کچھ نے اس سے پہلے ہی) اپنا انفرادی رنگ پیدا کرلیا تھا اور کچھ نے اس تحریک سے الگ اپنی راہ نکالی تھی، اسی طرح مراٹھی کے لکھنے والوں نے بھی 'نئی کہانی' سے متاثر ہوکر لکھتے رہنے کے بعد اپنا انداز اسلوب بدلا، مواد و ہیئت کے تجربے کیے اور کہانی کا نیا روپ نکھارا۔ اس مقدمے میں محض 'نئی کہانی' کا تعارف مقصود تھا اس لیے ۱۹۶۰ء کے بعد کی کہانی کا جائزہ کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

گنگا دھر گاڈگل

بے چہرہ شام

روز ہی کی طرح بمبئی کی وہ شام ملول تھی۔ اُس کے بھورے بالوں پر سورج کی کرنوں کی دھول بکھری ہوئی تھی اور چہرہ ہی سرے سے غایب تھا۔ سچ مچ کتنی بھیانک تھی یہ بات۔ بے چہرہ شام! لیکن کسی کو اِس بات کا کوئی احساس تک نہیں تھا۔ مٹرگشتی کرتا، پیروں کی قینچی سے راستہ کاٹتا ہوا میں گھر جا رہا تھا۔ پیروں کی اور بھی اَن گنت قینچیاں یہی کر رہی تھیں۔ کیسی دل چسپ بات! لیکن کسی کو اس پر ہنسی ہی نہیں آ رہی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپ سے چنگاری پھوٹی ۔ سرخی مائل زرد ۔ وہ ترچھی اوپر کو اُڑی اور غایب ہو گئی۔ ایک لمحے کا وجود ۔ وقت کا ایک ذرّہ اور روشنی کا بھی بس ایک ذرّہ ۔ اتفاقات کا ایک الجبرا۔ نظروں سے بچ کر نکلا ہوا۔

اور نظروں میں کھُبنے والے لمبے چوڑے روشن حروف قطار باندھے کھڑے تھے۔ کوئی ایک پیر پر، کوئی 'ا' کی ماترا کا سہارا لیے، کوئی 'ای' کی ماترا کی ٹوپی اوڑھے اِتراتے ہوئے۔ معنی اور حروف کی اشکال کا الجبرا بنانے کی ایک کوشش۔ اس کے سبب متوجہ ہونے والی بھیڑ۔

ایک ننھے سے بچے کی ہتھیلی پر اُس کی ماں نے ایک اِکنّی رکھی۔ وہ اِکنّی اُس نے اپنی انگلیوں کی پھسلتی ہوئی گرفت میں جکڑ لی۔ بے یقینی اور حیرت سے وہ اس اکنّی کو دیکھنے لگا، شاید اِس بات کا اطمینان کرنے کی خاطر کہ وہ چمکتا ہوا گول نشان اُس کی ہتھیلی پر ہی ہے، اُس لڑکے نے اپنا ہاتھ ہلایا اور پھر پورا منہ کھول کر بڑی سی بے دنداں ہنسی ہنسا۔ اُس کی گردن کا توازن قائم نہ رہ سکا۔ اُس کی آنکھیں جھُرّیوں کے جال میں پھنس کر تقریباً بند ہو گئیں۔ اُس کے منہ کے کونے میں رال کی ایک

ڈوری لٹکنے لگی اور ایک دم چونک کر اُس نے لمبے چوڑے لال رنگ کے پوسٹر پر نظر ڈالی۔ پوسٹر پر لوگوں کی مقبول ہیروئن مستقل مسکراہٹ لیے کھڑی تھی۔ A million dollar smile

راستے پر دوڑتے والی موٹروں کے کرخت ہارن خاموشی کے ٹکڑے اُڑا رہے تھے، کانوں کو ڈس رہے تھے۔ یونی فارم پہنے ہوئے ڈرائی ور، لال لال ہونٹوں والی پلاسٹک کی عورتیں، گنجے گوبر گنیش سرکاری افسر، جوانی کے نشے میں چور لمبے بالوں والے نوجوان، سارے مل کر لوگوں کو آواز دے رہے تھے کہ "دور باش"۔ اور اِن سب کے اعلانوں کی گونج بالکل یکساں تھی۔ یونی فارم پوش ڈرائی ور اور لال لال ہونٹوں والی عورتیں ایک ہی آواز اور ایک ہی زبان میں بول رہی تھیں۔ گوبر گنیش سرکاری افسر بھی خلافِ معمول بالکل صاف صاف اور اکھڑ انداز میں بول رہے تھے۔ اِس بات پر کسی کو تعجب نہیں ہو رہا تھا، اِس بات کا کسی کو خوف بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا!

راستے کے کنارے ایک دکان میں کوئی لاوڈ اسپیکر ایک فلمی گانا اُگل رہا تھا۔ اُس کا ایک مستقل پھیلا ہوا مُنہ تھا اور بس۔ اُس کا چہرہ تو تھا ہی نہیں۔ مُنہ کو ہلائے بغیر وہ گانا اُگل رہا تھا، اور آس پاس کی مختصر سی بھیڑ اس گانے کو مُنہ بھر بھر کے نوش کر رہی تھی۔ تین منٹ کی بھکتی، تین منٹ کا پریم، تین منٹ کی جُدائی۔

"نیلام کا مال تین تین آنا! کمپنی کا دِوالا نکل گیا! نیلام کا مال تین تین آنا"۔

دِوالیہ کمپنی؟ کون سی کمپنی ہوگی یہ بھلا؟ Universal Enterprise Ltd.

جی ہاں لمیٹڈ! سمجھے آپ؟

یہ ساری آوازیں ایک اور بلند آواز تلے دب کر رہ گئیں۔ چاروں طرف تختے لگی ہوئی ایک موٹر کار سڑک پر آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔

Peace in Korea!

Appeal for peace!

چاروں جانب توپوں کی مانند اُٹھے ہوئے لاوڈ اسپیکروں سے بار بار یہی اعلان ہو رہا تھا۔ ان آلات سے نکلنے والی آواز کی مشینی بازگشت بھی یہی مانگ کر رہی تھی:

Peace in Korea! Peace! Peace! Peace!

سامنے سے آرہا ایک شناسا میری طرف دیکھ کر ہنسا۔ میں نے اُس کی ہنسی تو دیکھی مگر اُسے سُن نہیں سکا۔ میں نے اُس کے مُنہ کی حرکت دیکھی اور اپنا مُنہ بھی ہلا دیا۔ اُس نے دوبارہ اپنے مُنہ کو حرکت دی۔ ہمارے الفاظ نہ جانے کہاں معدوم ہو گئے؟ صداؤں کی دنیا میں اُن کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ شاید اس کے بعد کبھی نہیں مل پائے گی۔ ہم نے بے آواز ہنسی کے ساتھ ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔

مستقل پھیلے ہوئے مُنہ سے لاوڈ اسپیکر بھونک رہے تھے ! Peace! Peace۔ جب وہ بھونکتا ہوا امن مجھ سے دُور چلا گیا تو اُس کے جھکڑ سے میرے دَم گھُٹے کان پھر سے سُننے لگے۔ آنکھیں پھر سے دیکھنے لگیں۔ پیروں کی قینچیوں سے راستہ کاٹتے ہوئے لوگ چلے جا رہے تھے۔ سب ایک جیسے تھے۔ لگتا تھا راستے کے موڑ کے اُس پار کوئی ٹکسال ہے جس میں ڈھل ڈھل کر یہ لوگ باہر نکل رہے ہیں۔ اُن کے بالوں کے انداز اُن کے پسندیدہ ہیروؤں کی طرح تھے۔ اُن کے چہرے چکنے گھُٹے ہوئے تھے اور جذبات؟ شاید وہ بھی چکنے اور گھُٹے ہوئے ہی تھے اور ساری عورتوں کے چہروں پر بچّوں کی سی معصومیت ناپ سے چھوٹی ٹوپی کی طرح جمی ہوئی تھی ۔Baby-faced! فلمی بچّے!

اِن بچّوں کے خالق ہیرو اور ہیروئنیں اُونچی جگہوں پر لگے پوسٹروں پر کھڑی فاتحانہ انداز میں ہنس رہی تھیں! ۔Million Dollar Smiles لاکھوں روپے قیمت کی مسکراہٹیں۔ لاکھوں لوگوں کی مسکراہٹیں!

بیس پچیس فلمی اداکاروں کی اتنی اولادیں ہو سکتی ہیں؟ ہرگز نہیں! لیکن یہ ممکن ہو گیا ہے اور سائنس دانوں نے تو نہ جانے اور کتنی باتیں ممکن کر دکھائی ہیں۔ اجنبی اور نامعلوم مرد سے اور ہم بستری کے بغیر عورت کو حمل ٹھہر سکتا ہے۔ مرد کا مادّہ تولید اب سالہا سال تک محفوظ رہ سکتا ہے۔ آئندہ پچاس سال بعد پیدا ہونے والے بچّے کا باپ ہٹلر ہو سکتا ہے۔ سائنسی علاج کے ذریعے دنیا میں آنے والے بچّے کا مزاج بھی بدلا جا سکتا ہے۔

"نئی دہلی، ۱۹ مئی ۱۹۹۱ء -
سائنسی ڈھنگ سے بچے ڈھالنے کے کارخانے کی رسمِ افتتاح آج وزیرِ اعظم فلاں ابن فلاں کے ہاتھوں یہاں بڑی دھوم دھام سے ادا کی گئی۔ کارخانے میں ڈھلا ہوا پہلا بچہ آج وزیرِ اعظم کو نذر کیا گیا۔ وزیرِ اعظم کے ایما پر اس بات کا التزام رکھا گیا ہے کہ اس بچے کے اندر شدید دیش بھگتی کا جذبہ پیدائشی ہو۔ وزیرِ اعظم نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ ملکی ترقی کے راستے پر یہ ہمارا اگلا قدم ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس سے ملک کی زندگی میں نظم و نسق پیدا کرنے کے راستے کی ایک بڑی رکاوٹ دُور ہو جائے گی۔ ہمارے خصوصی نمائندے کی اطلاع کے مطابق حسبِ خواہش خواب دکھانے والی گولیاں تیار کرنے میں بھی ہمارے سائنس دانوں کو کامیابی حاصل ہو گئی ہے اور قوی امکان ہے کہ جلد ہی تجارتی پیمانے پر ان گولیوں کی پیداوار شروع کر دی جائے۔ جانکار حلقوں میں اس توقع کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ ڈراونے خواب دکھانے والی کالی گولیوں کی خصوصی مانگ رہے گی۔"

اور میاں شیکسپیئر کا کہنا ہے

Life is a tale told by an idiot, signifying nothing.

مؤرکھ کہیں کا!

کہیں بے چہرہ شام ہنسی تو نہیں؟ کہ اس نے ہچکی لی؟

اوں ہوں! ایک بے چہرہ ــ جی نہیں ــ بچے جیسے چہرے والی لڑکی ہنستے ہوئے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ میں نے بھی ہوش میں آ کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولی "ہائے رام آپ کا دھیان کدھر ہے"؟

اُس کے آٹومیٹک ہاتھوں نے پرس کھولا، رومال نکالا، پرس کو بند کیا، رومال سے مُنہ پونچھا، دوبارہ پرس کھولا ....

میں نے کہا "کہیں تو نہیں، بس کسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا"

اُس نے آنکھیں مچکاتے ہوئے کہا "خیال؟ کس کا خیال؟"

اُس نے اپنا پلّو سنبھالا اور پیروں کو حرکت دی۔ میں ہنس پڑا، وہ بھی ہنس پڑی۔

اُس نے پوچھا "آپ نے وہ فلاں پکچر دیکھی؟"

اب اُس نے نظریں نیچی کرنے کی اداکاری کی۔ شاید وہ ابھی اس کی مشق ہی کر رہی تھی۔

میں نے پوچھا "کل میچ دیکھیں گی کیا؟"

ہم نے ایک دوسرے سے رُخصت لی۔ اپنی شخصیت کی تین منٹ کی رکارڈ بجا کر وہ آگے چل دی تھی۔ آگے جاکر نئے سرے سے وہی رکارڈ شروع ہو گئی ہوگی۔ اُس نے پرس کھولا ہوگا اندر سے رومال نکالا ہوگا، پرس کو بند کیا ہوگا....

گھر گھر بجنے والی تین منٹ کی رکارڈ

'قرنا ایک دلا دو مجھ کو

قرنا ایک دلا دو مجھ کو'

آگے؟ آگے کیا؟ اٹک گئی ہماری سوئی! انھیں الفاظ کی تکرار کرنے لگی۔

موٹر کے بریک کربہہ آواز میں بول اُٹھے، ایک بھیانک بیخ سنائی دی۔ لوگ گروہ در گروہ دوڑ پڑے۔ بھیڑ کا ایک دایرہ بن گیا۔ ایک آدمی اپنی جان سے ہاتھ دھو چکا تھا۔ بڑے تجسّس کے ساتھ سب اُسے دیکھ رہے تھے۔ ہر ایک کی آنکھ میں تجسّس تھا، خوف زدہ ہونے کی تمنا تھی۔ وہ ٹوٹا ہوا پیر دیکھنا چاہتے تھے۔ مرنے والے کے بُشرے سے، اُس کی جیب سے نکلنے والے کاغذات سے، اس کی شناخت کرنا چاہتے تھے۔

وہ لوگ بے رحم نہیں تھے۔ مرنے والا زندہ ہوتا تو انھوں نے اُس کے مُنہ سے پانی کا گلاس لگایا ہوتا، ایمبولنس منگوائی ہوتی۔ مگر اُن کے اندر وہ تجسّس بھی اپنا وجود رکھتا تھا جو ظالم تھا۔ اُن کے اندر متعدد متضاد رجحانات تھے۔ پکچر میں جارجٹ کی ساڑی پہننے والی اداکارہ کا دل ٹوٹ جانے پر وہ رو دیے ہوں گے، راشٹر بھکتوں کی تقریریں سُن کر جوش میں آمادۂ جنگ ہو گئے ہوں گے اور پولیس کے ڈنڈے دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے ہوں گے، اور پھر اپنے صفائی سے سٹک جانے کا قصہ سُنا کر ڈھٹائی سے ہنسے بھی ہوں گے۔ سنیما میں جنسی مناظر دیکھ کر انھوں نے سیٹیاں بجائی ہوں گی اور گھر آکر بڑی عقیدت کے ساتھ اُن مناظر کا اعادہ بھی کیا ہوگا۔ یہ سارے رجحانات اُن میں تھے اور یہ کب اور کیسے پلٹا کھائیں گے، یہ کہنا مشکل تھا۔ اِس وقت وہ چاہتے تھے کہ خوف زدہ ہوں اور خوف زدہ کرنے لائق وہ منظر تھا بھی۔

مرنے والے کے خون کی دھار کچھ دُور بہہ کر ایک جگہ تھم گئی تھی اور سب کی توجہ اس پر

لگی ہوئی تھی کہ دیکھیں وہ دھار آگے کس طرف کو بہتی ہے۔ آخر اُس دھار سے ایک طرف کو شاخ پھوٹ نکلی اور اُس طرف کھڑے ہوئے لوگوں کے پیروں کی جانب بڑھنے لگی۔ یہ دیکھتے ہی اُس طرف کھڑے لوگ شور مچاتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ اور پھر سبھی ہنس پڑے۔

میں نے ان کی وہ ہنسی سُنی اور مجھے اُس مرنے والے سے زیادہ اُن زندہ لوگوں سے خوف آنے لگا، اُن کے اندر جو انجانی اور منطق سے پرے رہنے والی شے تھی، اُس سے خوف آنے لگا۔ اُن کی اس ہنسی سے خوف آنے لگا۔ مرنے والے کی بکھر جانے والی چپلوں کو اُن لوگوں نے جس گمبھیر انداز میں اس کی لاش کے پاس لاکر رکھا، اس سے خوف آنے لگا۔ اور پھر انسانی فطرت کے رازوں سے پردہ اُٹھانے والے علوم اور حیاتِ انسانی کو ایک متعیّنہ روپ دینے کی اُن کی قوّت سے کچھ زیادہ ہی خوف آنے لگا۔

مجھے لگا کوئی سائنس داں آئے گا اور اس آدمی کے پیر کو کوئی کیمیائی محلول لگاکر جسم سے جوڑ دے گا، اُسے کسی دوا کا اِنجکشن لگاکر زندہ کر دے گا۔ پھر لوگوں نے اُس کی بغل میں رکھی چپلوں کو وہ شخص سچ مچ پہن لے گا اور اخیر میں اپنے بدن پر موٹر گاڑی چڑھانے والے ڈرائیور سے مصافحہ کر کے کہے گا۔ "دوست! اس قدر حسین خوف محسوس ہوا ہے کہ کیا کہوں! مرنے میں بھی ایک لُطف ہوتا ہے سمجھے! Thanks "

اس کے بعد بے شمار لوگ محض تفریحاً اپنے آپ کو مروانے لگیں گے۔ لوگوں کو مارنے اور جلانے والی کمپنیاں وجود میں آئیں گی، لوگ اُن کے شیئر خریدیں گے۔ موت سے متعلق سارے قانون، سارے تصوّرات اور سارے ردِّ عمل بدل جائیں گے۔ سائنس کی ایک لات انسانی زندگی کی کایا پلٹ کر دے گی اور اِس صدمے سے سنبھلنے سے پہلے ہی اُس کی کمر میں ایک اور لات پڑے گی، اور شاید ان پے در پے لاتوں کی مار کی تاب نہ لاکر ہی وہ فنا ہو جائے گی۔ اور انسانوں سے خالی اس زمین پر شہد کی مکھیوں کی تہذیب کا ارتقا ہوگا۔ بھیانک! یہ امکان بڑا بھیانک تھا اور وہ زندہ انسان؟ وہ بھی تو بڑے بھیانک تھے!

انسانی زندگی کا میلا، اُس کی خاص کشش تیزی سے چکراتا ہوا خوف کا جھولا۔ دیوی کے درشن کو جائیں تو پیسا خرچ ہوتا ہے اور جھولے میں بیٹھنے کے لیے بھی پیسا خرچ کرنا پڑتا ہے۔ مندر

میں جانے پر جوشِ عقیدت سے آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، جھولے میں بیٹھنے پر بھی خوف سے آنکھیں پٹ سے بند ہو جاتی ہیں، پھر باقی رہ جاتا ہے اندھیرے میں ٹٹولنا! عقل کا تانبے کا پیسا لے کر ہم اس میلے میں آتے ہیں لیکن اس کا استعمال ہوتا ہے سوا ایسا!

اس کے بجائے ریوڑیاں کیوں نہ کھائی جائیں؟ چکنی میٹھی!

لیکن ریوڑیاں کھانے والوں کو بھی سموچا اُٹھا کر خوف کے جھولے میں بٹھا دیا جاتا ہے اور زور زور سے چکر کھلائے جاتے ہیں۔

خوف! اخبارات کی شاہ سُرخیوں کا خوف، بڑے بڑے جلی حروف، قطار باندھے کھڑے متعدد خوف! بے چہرہ خوف! عظمت کا خوف اور ذلّت کا بھی، علم کا اور جہالت کا بھی۔ بندھن کا اور آزادی کا بھی، اوروں کا اور خود اپنا!

خوف کے بڑے بڑے لہراتے سانپ! اور سیڑھیاں! زندگی سانپوں اور سیڑھیوں کا کھیل ہے۔ سیڑھیوں سے اوپر جائیے اور سانپ نگل لیں تو نیچے آ جائیے۔ بڑی سیڑھیوں کی بغل میں بڑے سانپ۔ بہت اوپر اور بہت نیچے۔ ہاتھ میں جھنجھناتا ہوا مگر نامعلوم مستقبل! زور زور سے چکر لگاتا ہوا خوف کا جھولا!

بمبئی کی وہ شام ملول تھی اور اپنے پیروں کی قینچی سے راستہ کاٹتے ہوئے میں گھر جا رہا تھا۔ نہ جانے کہاں سے ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اوپر اُڑتی ہوئی ایک پتنگ سرسرائی۔ کسی درخت کے چھوٹے چھوٹے پتے ہلے، ایک ننھے سے بچّے نے "او" کی آواز نکالتے ہوئے اپنا چھوٹا سا ہاتھ اوپر اُٹھایا اور دوڑ پڑا، پر چونیے کے لڑکے نے جھٹ سے گُڑ کا ٹکڑا مُنہ میں ڈال لیا۔ راستے کی دھول کو پھونک سے اُڑاتے ہوئے ہوا کا جھونکا اِدھر سے آیا، اُدھر چلا گیا۔

میرے خیالات کے صفحات پلٹے گئے، دل کے پتّے پھینٹے گئے، میرے ہاتھ میں صرف پانچ پتّے دے کر کسی نے کہا "حکم بولو!"

میں نے کچھ سوچا اور پھر کہا "کھُلنے والا پتّا"!

کتنی ہی بار تقسیم کرنے پر بھی پتّے پسند نہیں آ رہے تھے اور میرا حکم طے نہیں ہو رہا تھا۔ اتنے میں کسی کے دھکّے سے ایک پتّا گر کر کھُل گیا۔ پان کی بیگم۔

لیکن یہ دھکا کس نے دیا تھا؟ اُس نے؟ وہ کون تھی؟ مجھے کہاں پتا تھا؟ میں نے اُسے دو یا تین مرتبہ ہی تو دیکھا تھا۔ وہ میرے سامنے ہی پُشت کیے کھڑی تھی۔ بوٹا سا قد اور بھرے بھرے بازو۔ گردن اُٹھائے وہ کسی سے بات کر رہی تھی۔ اُس کے کان سُرخی مائل لگ رہے تھے۔ اس کے بالوں پر روشنی کی موجیں لہرا رہی تھیں۔ اُوپر دیکھنے کی وجہ سے اُس کے بالوں کا جوڑا اُس کی نازک گوری گردن کا سہارا لیتا ہوا تھوڑا اُوپر کو اُٹھا ہوا تھا اور یہ منظر دیکھتے دیکھتے میرے دل کو بھی کسی نے سموچا اپنے ہاتھوں میں تھاما اور تھوڑا اُوپر اُٹھا دیا۔ بات کرتے ہی اُس کا لپٹا ہوا پلّو پھسل گیا اور پیٹھ پر لہرانے لگا۔ اُس کے بلاوز کے وی کٹ گلے سے وہ لُبھاونی نازک گوری تکون دکھائی دی اور اُس کے ایک زاویے پر سے پھسلتی ہوئی میری نگاہ اس کے کولھوں کی گولائی پر ذرا کی ذرا ٹھٹکی اور پھر اُس کے گلابی قدموں میں جا گری۔

اپنی جگہ سے ہلنا دشوار تھا، اُس پر سے نظریں ہٹانا دشوار تھا۔ کنپٹیوں میں زور زور سے دھمک ہو رہی تھی، بدن بے قابو ہو گیا تھا۔ مجھے وہ چاہیے تھی۔

میں نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو وہ بھی چہرے پر بچّوں کے سے بھاؤ رکھنے والی دوسری لڑکیوں سے مختلف نہ تھی۔ عین ممکن تھا کہ اُس کی شخصیت کی رکارڈ بھی تین منٹ میں ختم ہو جائے۔ میں نے اُس سے کبھی بات نہیں کی تھی۔ بات کرنے کا امکان بھی اِس وقت نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی میرا دل اس میں اٹکا ہوا تھا۔

"محبت؟ کون سی محبت چاہیے صاحب؟ 'پہلی محبت' 'گلابی محبت' 'باغی پیار' سب کی قیمت تین روپے ہے صاب۔ تحفے میں دینے کے لیے زیادہ مہنگی کتابیں نہیں چلتیں۔"

کسی نے میرے کانوں میں سرگوشی کی لیکن میں نے سُنی اَن سُنی کر دی۔

"اس کا کیمیائی سبب یہ ہے کہ . . . ." بچّے ڈھالنے والے کارخانے سے متعلق ایک ماہر سائنس داں بولنے لگا۔ لیکن میں نے اس کی بات نہیں سُنی۔

میں نے اپنا دل اُس کے قدموں میں ڈال دیا اور آگے کو چل دیا۔ اُسے اپنے پیروں تلے کچل کر وہ بھی نہ جانے کدھر کو چلی گئی۔ دل زخمی ہو کر اُسی طرح دھول میں پڑا رہ گیا اور اسی لیے جنابِ دل بہت خوش بھی تھے۔ اُن کے زخموں سے خون نہیں، اُن کی خوشی بہہ رہی تھی۔

اپنے دل کو وہیں چھوڑ کر۔ میں خاموشی سے پیروں کی قینچی سے راستہ کاٹتا ہوا آگے کو چلا۔ سچ مچ جو کچھ سرزد ہوا تھا وہ کس قدر عجیب اور بھیانک تھا مگر مجھے اس کا کوئی غم نہ تھا۔ میں ایک سگریٹ پینے کا ارادہ کر رہا تھا۔

بمبئی کی وہ شام ملول تھی۔ اُس کے بال بھورے تھے اور اُس کا چہرہ سرے سے غایب تھا۔

اروند گوکھلے

منجُولا

ٹرین چونکتی، جھکولتی اور ہانپتی ہوئی بھاگی جا رہی تھی۔ ہر ڈبّا آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بیٹھنے کی بنچوں اور اُن کے درمیان کی کھُلی جگہوں کا دَم بھیڑ سے گھُٹا جا رہا تھا۔ دروازے اور کھڑکیاں، بُش شرٹوں، دوپٹوں اور ساڑیوں، بالوں بھرے سَروں اور تھکے ماندے اعضا سے لیپی جا چکی تھیں۔ لوگ ڈبّوں سے باہر بھی لٹکے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ چیونٹیوں بھرے سانپ کی طرح تڑپتی ہوئی رینگ رہی تھی ٹرین۔ یہ دو مُنہا کیچوا جیسے ہی رُکتا اندر کی گندگی باہر پھینکی جاتی اور اس سے کہیں زیادہ اندر داخل ہو جاتی۔

آدمی ہی آدمی۔ ہر ایک چال سے فٹ پاتھ پر یا پلیٹ فارم پر اور وہاں سے ٹراموں یا ٹرینوں میں۔ ٹرینوں کی بھیڑ تو انتہا سے گذر جاتی۔ پھر بھی دن میں دو مرتبہ تو ٹرین کا سفر کرنا ہی پڑتا تھا۔ صبح کو آفس جانے کے لیے اور شام کو گھر لوٹنے کے لیے دو مرتبہ جہنم کے عذاب سے گزُرنا ہی پڑتا تھا۔ بڑی مشکل سے اندر داخل ہونا نصیب ہوتا تھا۔ پھر بچنے کی کتنی ہی کوشش کی جائے، کسی نہ کسی کا دھکّا لگ ہی جاتا سر سے کسی کے ہیٹ کا سِرا گھِستا رہتا، کبھی کندھا مسُلا جاتا، اجنبی انگلیاں رانوں سے چپکی رہتیں، پیروں پر جُوتوں کے نشان اُبھر آتے اور سارے جسم کی مالش ہو جایا کرتی۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کی بھی تو گنجائش نہ رہتی کیوں کہ کسی کی چندیا کا پسینا، کسی کی داڑھی کی کھونٹیاں تو کسی کی گردن پر پاوڈر کی چکتی تہیں نظر آتی رہتیں اور چُپ چاپ کھڑے رہنے پر بھی ایک دوسرے کی سانسیں اور پسینے کی بُو ناک اور مُنہ میں گھُس کر کراہیت پیدا کرتی رہتی۔ دیدوں کے مقابل، نتھنوں سے لگے، ہر ہر مسام سے جُڑے، مُردہ دلوں اور کراہیت انگیز جسموں کے مالک بے شمار انسان!

اس کے باوجود شام کا سفر تھوڑا سکون بخش لگتا۔ صبح کو تو جیسے تیسے کچھ زہر مار کرکے گاڑی پکڑنے کے لیے بھاگنا پڑتا، ڈبے میں دھکے کھاتے اور انتظار میں تھکتے ہوئے کھڑا رہنا پڑتا۔ پھر اسٹیشن سے آفس تک پیدل چلنا پڑتا تھا۔ اس اُتھل پتھل میں صبح کے اشنان اور میک اپ کا ستیاناس ہو جاتا۔ ادھوری چبائی ہوئی چپاتیاں پیٹ میں چبھنے لگتیں، اُس پر آفس میں مغز ماری۔ یوں تو شام کو بھی گاڑی میں بھیڑ اور دھکم پیل ہوتی مگر گھر جا کر اطمینان سے منہ ہاتھ دھونے، آرام سے کھانا کھانے اور سکون سے سو جانے کی توقع تو تھی۔

ملے دَلے ہوئے لوگ سوا چھے کی ٹرین سے اپنے اپنے ڈبے کی جانب رواں تھے۔ ٹائیاں ڈھیلی کیے ہوئے، ہاتھوں میں شام کا اخبار تھامے ہوئے مرد، گندے رومالوں سے آخری پسینا پونچھتی اور تھکے ہوئے ہاتھوں سے گرتے ہوئے پرسوں کو سنبھالتی ہوئی عورتیں۔ ٹھنڈی سانسیں چھوڑی جا رہی تھیں، جمائیاں جم رہی تھیں، تھکی ماندی آنکھیں بڑی بے صبری سے اپنے اپنے اسٹیشن کی راہ تک رہی تھیں اور ٹرین کے رُکتے ہی آخری زور کے ساتھ باہر نکلنے کی جدوجہد بھی جاری تھی۔

اندھیری اسٹیشن کے آتے آتے منجولا ڈبے سے باہر نکلنے کی پوری کوشش میں لگ گئی۔ چرچ گیٹ پر اُسے جو ایک سیٹ سے ٹک کر کھڑا ہونا نصیب ہوا تو اندھیری تک وہ وہاں سے ہل نہیں سکی تھی۔ سیٹ پر بیٹھا ہوا موٹا گجراتی اُسے دیکھتا اور آہستہ آہستہ اُس کی طرف کھسکتا رہا تھا۔ اُس نے ذرا سا سرک کر اُسے جگہ دینے کی پیشکش بھی کی تھی مگر وہ سیٹ کی پشت گاہ کا سہارا لیے چُپ چاپ کھڑی رہی اور اس کا سہارا لیے ایک اور ملازمت پیشہ نوجوان لڑکی۔

سامنے دودھ کے خالی ہنڈے لیے ایک بھیا بیٹھا تھا اور باقی دونوں طرف بہت سے لوگ بھیڑ کیے کھڑے تھے۔ بھیڑ نیچے اُترتی، جگہ سے سرکتی اور پھر سے جوں کی توں دکھائی دیتی۔ گاڑی کے اندھیری اسٹیشن کے احاطے میں داخل ہو جانے پر بھی باہر نکلنے کے لیے راستہ ملنا دشوار نظر آ رہا تھا۔ گجراتی، بھیا، چپکی ہوئی لڑکی اور دونوں طرف انسانی دیواریں۔ آخر منجولا نے ساری کے پلّو کو کس کر لپیٹا، پرس کو مضبوطی سے تھاما اور آنکھیں بند کر کے دروازے کی سمت بڑھنے لگی۔ بے شمار دھکے، کندھوں پر دباؤ، بازوؤں میں چٹکیاں، جوڑے کو جھٹکے اور منجولا باہر آ گئی۔

اسٹیشن سے باہر نکل کر وہ تیز تیز چلنے لگی۔ بال بالکل روکھے ہو چکے تھے اور اِدھر اُدھر اُڑ رہے تھے۔ ہونٹ خشک تھے اور آنکھیں تھکی ماندی۔ بغل اور پیٹ پسینے سے چپکٹ ہو رہے تھے۔ دوپہر بھر ٹائپ رائٹر کوٹتے رہنے سے انگلیوں میں درد ہو رہا تھا اور اب چلنے سے پہلے ہی پیر دُکھنے لگے تھے۔

" منجولا آ آ آ ... مسز کھارکر!"

منجولا نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ٹھٹک کر رُک گئی۔ کاشی گلگرنی پرس نچاتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ منجولا کے آفس کے قریب ایک دفتر میں ملازم تھی وہ۔ دونوں صبح کو ایک ہی ٹرین سے سفر کیا کرتے مگر واپسی میں وہ منجولا کو کبھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ دونوں سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگیں۔

" روزانہ اسی گاڑی سے لوٹتی ہیں آپ؟" منجولا نے پوچھا۔

" کہاں! آج ہی لوٹی۔ روزانہ تو ساڑھے سات ہی کی ٹرین ملتی ہے۔"

" اتنی دیر ہو جاتی ہے آفس میں؟"

" نہیں، چھٹی تو چھے ہی بجے ہو جاتی ہے مگر بعد میں گھر کی تلاش میں بھٹکنا پڑتا ہے۔ کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی جگہ کا پتا دیتا ہے اور میں چلی جاتی ہوں وہاں، پھر پچھتاتی ہوں ... کہیں بھی ..."

گھر کے مسئلے کا چرچہ شروع ہوتے ہی منجولا اُکتانے لگی۔ سال بھر پہلے وہ ان ساری مشکلوں سے گذر چکی تھی اور اب ہر روز صبح و شام گھر نہ ملنے کی شکایتیں سنتے سنتے تنگ آ چکی تھی۔ تھوڑی دیر چپ رہ کر وہ اچانک بول اُٹھی " آپ شادی کر لیجیے۔ آپ کا ..."

" شادی تو طے ہو چکی ہے میری، اسی لیے تو گھر ڈھونڈ رہی ہوں۔ ڈیڑھ سال ہو گیا شادی طے ہوئے۔ ہم دونوں چھے دن تک ساری بمبئی میں کمرہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور ساتویں دن شہر سے باہر جا کر، رہنے کو جگہ نہ ملنے کے غم میں منہ لٹکائے ہوئے پیار کا جشن مناتے ہیں۔"

منجولا کا چہرہ اُتر گیا، کاشی کی کہانی سن کر نہیں، اِس خیال سے کہ اُس نے بھی پہلے پریم کیا پھر گھر تلاش کیا اور تب شادی کی ... مگر ...

" میں ذرا سبزی خرید لوں، کچھ دیر رُکیں گی آپ؟" منجولا نے کہا اور راستے کے کنارے کھڑے سبزی ترکاری کے ٹھیلوں کے پاس رُک گئی۔ رومال میں پیاز لی، پرس میں مرچیں اور کوتمیر ڈالی اور ہاتھ میں ناریل لے کر وہ آگے بڑھ گئی۔ کاشی اُسے رشک سے دیکھ رہی تھی۔ آخر جب نہیں رہا گیا تو بولی۔

"مسز کھارکر، آپ لگی ہیں!"

"آپ کو بھی مل جائے گا گھر۔ میں پوچھ تاچھ کروں گی آپ کے لیے۔ ہمارے آفس کے سپرانیم کو پتا ہوتا ہے خالی کمروں کا۔"

دونوں کی مسکراہٹیں روکھی پھیکی تھیں۔ پھر کاشی گلکرنی اپنی راہ چلی گئی۔

منجولا تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ ابھی خاصا فاصلہ طے کرنا تھا۔ گھر جاکر پانی بھرنا تھا، کھانا پکانا تھا۔ نہانے کی خواہش ہو رہی تھی اور بھوک بھی لگ رہی تھی۔ شرد واپس آچکا ہو تو اسے چائے بناکر بھی دینی ہوگی۔

شرد کا خیال آتے ہی منجولا سہم سی گئی۔ گھر سے نکلنے کے بعد ٹکٹ چیکر، ٹرین کا اندھا، آفس کا باس، سپرانیم، اکاؤنٹنٹ کاولے، میری ڈی سوزا اور سرل ساٹھے، چائے والا بھٹ، چرچ گیٹ پر ایک آنکھ دبانے والا بڈھا، ٹرین کا گجراتی، کاشی گلکرنی، سبزی والا بھیا..... اس سارے سیٹ اپ میں شرد کا کہیں پتا نہ تھا۔ جس پر برابر کا پریم کر کے گھر سنسار بسایا اُسی کا۔ منجولا بڑی شدت سے اُس کی طرف کھنچنے لگی، لیکن دوسرے ہی لمحے اُس کا دل منجمد سا ہوگیا اور قدموں کی رفتار سست پڑ گئی۔

قریب سے نکلتی ہوئی ایک کار میں الو بلی موریا جارہی تھی۔ رفتار کم کرکے وہ منجولا سے بولی۔

"لفٹ؟"

"نہیں شکریہ۔ بس آ ہی چکا ہے گھر۔"

منجولا کے قدم بڑھتے چلے گئے۔ اب اُس کے دماغ میں الو کا خیال چکرانے لگا۔ الو بھی کسی ہوائی سفر کی ایجنسی میں ملازمت کرتی تھی۔ مگر وہ بہت خوش و خرم رہا کرتی۔ شوہر سے عرصہ ہوا طلاق لے چکی تھی اور ہر روز ایک نئے دوست کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی، اُسی کی کار، اُسی کے پیسے! اُس کے بدن پر سجنے والی فراکیں اور ہونٹوں پر چمکنے والی لپ اسٹکیں بھی دوستوں کے تحفے ہوا کرتیں۔ سب اُنگلیاں اُٹھاتے تھے مگر الو کو پروا ہی نہیں تھی۔ کالج کی پرانی سہیلیوں نے ایک مرتبہ مل کر گھوڑ بندر کی ٹرپ کا پروگرام بنایا تھا، اُس وقت الو نے کھل کر منجولا سے دل کی باتیں کہی تھیں۔ شادی راس نہیں آسکی ہے مجھے۔ شوہر کچھ کماتے نہیں اور اپنی شوقین طبیعت کو دبانا میرے

بس میں نہیں۔ شوہر کے رشتے داروں کی بھیڑ بھاڑ بھی کم ہونے کا نام نہیں لیتی اور میرا بچپن کا دوست بھی آ جائے تو سب شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔"

آخر الوٗ بلی موریا نے بغاوت کر ڈالی اور آزاد ہو گئی۔ آزاد تو نظر آتی تھی مگر اس کے برتاو سے لگتا تھا کہ تباہ و برباد ہے۔

الوٗ کی یادوں کو بڑھتا دیکھ کر منجولا گھبرا گئی۔ اُس کا شرد تو کماتا تھا اور گھر پر رشتے داروں کو روز لاتا بھی نہیں تھا۔ وہ خود بھی دوست بنانے سے کتراتی تھی اور فضول خرچیوں سے دامن بچاتی تھی۔ الوٗ بھی اُسے "ہیپی ہاوس وائف" کہہ کر بلاتی تھی۔ اس کے باوجود ....

منجولا جب اپنی چال کے قریب پہنچی تو اندھیرا ہو چکا تھا اور بتّیاں جل چکی تھیں۔ دن ختم ہو جانے کا احساس ہوتے ہی اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ مرد اپنے کمروں کے باہر ننگ دھڑنگ بیٹھے ہوئے تھے، گپیں ہانک رہے تھے، بچّوں کو کھلا رہے تھے۔ اُن کے ننگے بدن اور اَن گنت بچّے دیکھ کر منجولا کو متلی سی ہونے لگی۔ سر گھُما دینے والے گراموفون اور ریڈیو زور و شور سے بج رہے تھے۔ سینما کے سنگیت کی فرمائشیں جاری تھیں۔ اپنے سنگیت کے شوق کا قاتل وہ شور سُن کر منجولا اور بھی کھولنے لگی۔

زینہ طے کر کے وہ اپنے کمرے کی طرف آئی۔ شرد واپس آ چکا تھا اور آرام کرسی پر لیٹا ہوا تھا۔ چپلیں اُتارتے ہوئے اُس نے پوچھا "کب آئے ؟"

"ابھی ابھی۔"

"میری چھے پانچ کی ٹرین بس تھوڑی دیر کے لیے چھوٗٹ گئی۔"

پرس اور ترکاری پھینک کر وہ اندر کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ پانی کی بالٹی خالی پڑی تھی۔ صبح باہر نکلنے سے پہلے اُس نے بالٹی بھر رکھی تھی۔ شرد نے ساری بالٹی اُلیچ ڈالی تھی۔ منجولا چڑ گئی۔ کم از کم پھر سے بھر کر تو رکھی ہوتی۔ صبح آفس جاتے وقت اُتارا ہوا پاجامہ بھی اُسی طرح پھیلا پڑا تھا۔ اُس کی ساری بھی فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ منجولا نے ساری اور پاجامے کو پیر سے کونے میں دھکیل دیا۔ باہر سے شرد چلّایا۔

"کیا کر رہی ہو ؟ چلو ذرا باہر گھوم آئیں !"

"آتی ہوں بابا، ابھی تو آئی ہوں۔"

اُس نے بالٹی اٹھائی اور باہر آگئی۔

"ذرا منہ ہاتھ دھولوں، پھر چلتے ہیں۔" شرد کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے کہا اور برآمدے سے گذر کر ٹنکی کی طرف بڑھ گئی۔ شرد نے آگے بڑھ کر پانی لانے کی پیشکش تک نہیں کی، اِس کا دُکھ ہوا اُسے۔ نل کے پاس جاکر اُسے انتظار میں کھڑا رہنا پڑا۔ کوئی بالٹیاں بھر رہا تھا، کوئی مُنہ ہاتھ دھو رہا تھا۔ اُس نے اپنی بالٹی آدھی ہی بھری۔ پوری بھری ہوئی بالٹی اُٹھالے جانے کی سکت ہی کہاں باقی رہی تھی۔

مُنہ ہاتھ دھونے اور کپڑے بدل لینے کے بعد وہ بہتر محسوس کرنے لگی، ہلکی پھلکی اور تازہ دم ہوگئی۔ آئینے میں جی بھر کے اپنا چہرہ نہار لینے کے بعد وہ خوش ہوکر شرد سے بولی "چلو!"

شرد اسی طرح کرسی میں دھنسا رہا اور ترش ہوکر بولا "اب کہاں جائے گی، آٹھ تو یہیں بج گئے۔ تمھارا بننا سنورنا ہی ختم نہیں ہورہا تھا گھنٹے بھر سے۔"

منجولا بھڑک اُٹھی۔ چڑ کر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ شرد پھر بول اُٹھا "خود پر سے توجہ ہٹتی ہی کب ہے تمھاری۔ چائے تک کے لیے نہیں پوچھا۔"

یہ سُنتے ہی منجولا کا چہرہ اُتر گیا۔ کافی دیر تک کوئی جواب نہیں سوجھا اُسے۔ آخر بڑی کوشش کے بعد وہ بولی "اے... سوری ہاں! اِدھر دیکھو نا! میں بہت تھک گئی تھی اس لیے خیال نہیں رہا رُک جاؤ ابھی پتیلی چڑھاتی ہوں۔ اتنے ناراض کیوں ہوتے ہو؟"

مگر شرد کا غصہ کم نہیں ہوا۔ وہ منجولا کو دور ہٹاتا ہوا بولا "رہنے دو، میں ہوٹل میں پی لوں گا۔ سچ مچ مت بناؤ۔"

اُسے اُٹھ کھڑا ہوتا دیکھ کر وہ بولی "تو پھر چلیں باہر؟"

"نہیں، جی نہیں چاہ رہا۔ اور جائیں بھی تو جلد واپس چلنے کا تقاضا شروع کردیتی ہو تم۔ کھانا پکانا ہے، پانی بھرنا ہے۔"

"تو آؤ آج باہر ہی کھالیتے ہیں کھانا۔ اور پانی سویرے بھرلیں گے۔"

"باہر کے کھانے کی چٹیک لگ چکی ہے تمھیں۔ اور پھر پیسے کہاں ہیں۔ چائے پینے بھر کے دو

آنے بچے ہیں جیب میں۔"

منجولا غصّے میں بے قابو ہوگئی۔ اُس نے میز پر پڑا ہوا ناریل زور سے پٹک کر پھوڑ ڈالا۔ اُس کا جی چاہا ناریل کا پانی پی لے مگر غصّے میں اس نے سارا پانی بہہ جانے دیا، رومال میں بندھی پیاز اور پرس میں رکھی ہوئی مرچیں اور کوتھمیر لے کر وہ پیچ وتاب کھاتی ہوئی اندر چلی گئی۔

شرد دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا اور سگریٹ جلا کر دھواں چھوڑنے لگا۔

منجولا نے چولھا جلایا۔ پیاز اور کوتھمیر کو چیرا۔ ترکاری بنانے کے لیے برتن چولھے پر چڑھایا۔ پھر اسے اُتار کر چائے کے لیے پتیلی چڑھائی اور اس میں بھول سے پیاز چھوڑ دی۔ پھر اُسے بھی اُتار لیا اور چائے کے لیے دوسری پتیلی چڑھائی۔

شرد آہستہ سے اُس کی پشت پر آ کھڑا ہوا اور نرم لہجے میں بولا "منجو!"

منجولا کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ کندھے پر دھرا ہوا اُس کا ہاتھ وہ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔ " ابھی تیار ہوئی جاتی ہے چائے۔"

" واقعی نہیں چاہیے مجھے، کیوں بنائی؟ اور سنو، آج ہم باہر ہی کھالیں گے کھانا۔"

"یہ رہی چائے!" چائے چھانتے ہوئے منجولا نے کہا۔" اور باہر کیوں کھائیں؟ تمھارا پسندیدہ سالن بن رہا ہے آج، دیکھو تو سہی۔"

شرد نے پیار سے اس کے کندھے دبائے۔ پھر چائے ختم کر کے بولا "کچھ اور مت بناؤ اب۔"

" چپاتیاں تو بنالوں"

" نہیں ہاتھ دُکھ رہے ہوں گے تمھارے، میں بریڈ لے آتا ہوں۔"

"یوں صبح کا تھوڑا سا بریڈ اور ڈیڑھ چپاتی رکھی ہے۔ خیر اگر جا ہی رہے ہو باہر تو سامنے جو نیا سندھی ہوٹل کھلا ہے نا وہاں سے تھوڑی سی مٹھائی . . . ."

منجولا کے کھلے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے شرد نے پوچھا "کیوں؟"

منجولا کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ وہ چپ چاپ ترکاری میں چمچ چلانے لگی۔ شرد خاموشی سے دوسرے کمرے میں گیا اور پھر گھر سے باہر نکل گیا۔ آنکھوں میں سمٹ آئے آنسوؤں کو منجولا نے کھلی چھوٹ دے دی۔ اُسے یاد آیا کہ ڈاکٹر صاحب نے اُسے آنکھوں کا خیال رکھنے کی تاکید کی تھی۔ اس پر

مزید آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ پڑا۔ ڈاکٹر صاحب نے تو تبدیلیِ آب و ہوا کا مشورہ بھی دیا تھا۔ منجولا کے ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں اینٹھنے لگیں۔ چلنے اور دیر تک کھڑے رہنے سے اس کے پیر دُکھنے لگے تھے۔ چار پانچ گھنٹے تک مسلسل ٹائپ رائٹر کوٹتے رہنا پڑا تھا۔ اس کی ٹھک ٹھک کانوں میں گونجنے لگی، تیز ہوتی گئی اور اب تک قابو میں رہنے والا سر پھٹنے لگا۔

کھانا بنا کر وہ باہر کے کمرے میں آئی۔ دروازہ پاٹوں پاٹ کھلا تھا۔ کونے میں پڑی آرام کرسی، میز، پلنگ، کتابیں ــــ سارے گھر سنسار پر منجولا نے خالی خالی نظریں ڈالیں۔ ایک ایک چیز جٹانے میں کتنا سُکھ ملا تھا اُسے! صرف ڈیڑھ سال اُدھر کی تو بات ہے، اور آج یہ سب کیا ہو گیا؟ وہ سارا جوش و خروش اتنی جلدی کیوں کر ختم ہو گیا؟ پہلے بھی تکلیفوں کا سامنا تھا۔ پھر اوروں کے مقابلے میں تو بڑی خوش نصیب ہے وہ۔ کاشی کلکرنی کو دیکھو۔ گھر سنسار بسانے کے لیے سرے سے گھر ہی نہیں ہے۔ الو بلی موریا کا شوہر نکھٹو نکلا۔ میرا گھر سنسار تو دو کمروں اور دو نوکریوں پر اُستوار ہے۔ پھر بھی یہ جھگڑا، یہ تنا تنی؟ کہاں خرابی ہے؟ کہاں ہے بگاڑ؟

وہ کمرے میں یوں ہی کھڑی رہی۔ پھر برآمدے میں چلی گئی، پھر واپس چلی آئی۔ برآمدے میں سکون سے کھڑے رہنا مشکل تھا۔ مسلسل آمد و رفت اور شور و غوغا۔ پھر کھڑے رہنے لائق بات وہاں تھی بھی کون سی؟ رسوئیوں کا دُھواں اور سنیما کے گیت۔ پڑوسیوں سے بات کرنے کو بھی من نہیں کر رہا تھا۔ اپنے اپنے کاموں اور اُلجھنوں میں اُلجھے ہوئے تھے سب۔ کمرے ہی میں اچھا لگ رہا تھا اور اچھا نہیں بھی لگ رہا تھا۔

ساڑھے نو بج گئے تو بھی شرد کا پتا نہ تھا۔ جی چاہ رہا تھا وہ جلدی سے آجائے اور جی چاہتا وہ نہ آئے۔ اُس کے آنے پر ہی کھانا کھایا جا سکتا تھا۔ پر کھانا کھاتے ہی . . .

منجولا اُداس ہو گئی۔

لیکن شرد کے آتے ہی منجولا کی بے چینی ختم ہو گئی، اُس کے مٹھائی لے آتے ہی وہ بے اختیار خوش ہو گئی۔ فوراً کھانا پروسنے لگی۔ مٹھائی اور سالن کے دو حصے کیے۔ شرد کو زیادہ حصہ دیا اور پھر اُس کی تھالی میں سے لے کر کھایا۔ آفس کے سپرانیٹنڈنٹ کے لطیفے بیان کیے اور شرد کے برابر خود بھی قہقہے لگائے۔ کھانا ختم ہوتے ہی شرد کو کمرے سے نکال کر اُس نے جھوٹے برتن سمیٹے۔

منجولا کے باہر کے کمرے میں آنے تک شرد نے فرش پر گدّوں کے بستر لگا دیے تھے اور سگریٹ پھونکتے ہوئے آرام کرسی پر پھیلا پڑا تھا۔ بچھے ہوئے گدّے اور سگریٹ کا دھواں دیکھتے ہی منجولا کی کھلی ہوئی طبیعت پر اوس پڑ گئی۔ اُسے خوف محسوس ہونے لگا، کراہیت پیدا ہوئی۔ اور وہ چڑ کر بولی۔ "سوتے وقت سگریٹ کیوں پی رہے ہو تم؟"

"ابھی سونے کا وقت کہاں ہوا ہے؟"

"دس بج چکے ہیں۔"

"تو سو جاؤ تم۔"

"لیکن بتّی جل رہی ہو تو مجھے نیند نہیں آتی۔"

شرد بھی چڑ گیا۔ ایک طویل کش لے کر اُس نے سگریٹ بجھا دی۔ بولا "تمھیں بتّی سے تکلیف ہوتی ہے، سگریٹ سے تکلیف ہوتی ہے۔"

منجولا خاموش رہی۔ بستر پر لیٹ گئی اور آنکھوں پر آڑا ہاتھ رکھ کر پڑی رہی۔ شرد تلملا کر اُٹھا، دروازہ بند کر کے بتّی گُل کی اور بغل کے بستر پر لڑھک گیا۔ پھر چاروں اور خاموشی چھا گئی۔

تھوڑے وقفے کے بعد شرد کی آواز اُبھری: "آؤ۔"

ایک انجانی ٹیس سے بھری ہزاروں سوئیاں منجولا کے سارے بدن میں چُبھ گئیں۔ جس جھگڑے کا ڈر اُسے لگا ہوا تھا وہی جھگڑا اندھیرے میں بھوت بن کر سر اُٹھانے لگا۔ بڑی دقّت سے اُس نے کہا "نہیں۔"

"خفا ہو گئیں؟"

"اوں ہوں۔"

"ایسا کیوں کرتی ہو؟ کیا ہو گیا ہے تمھیں؟ آؤ نا؟"

"رہنے دو۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

اندھیرا ہو جانے کے باوجود منجولا نے آنکھوں پر سے ہاتھ نہیں اُٹھایا تھا۔ آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا کر شرد کی گردن میں اپنی باہیں ڈال دینے کی خواہش اُس کے من میں اُبھری لیکن

اُس کے اعضا کی ساری قوّت چھن چکی تھی اور اس کی پیٹھ بستر سے چپک کر رہ گئی تھی۔

" نیند تو تمھاری گردن پر دائم سوار ہو گئی ہے۔ ہمیشہ کے لیے سو جاؤ!"

شرد کے غصّے سے بھرے الفاظ کانوں میں پڑتے ہی منجولا اُٹھ بیٹھی۔ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔" کتنے چڑ جاتے ہو تم! تم اور میں دونوں ہی ___ چلو کچھ باتیں کریں ___ یا شطرنج کھیلو گے؟ ___ نہیں تو باہر گھومنے چلیں۔"

" نہیں تم سو جاؤ۔ جاگنے سے طبیعت بگڑ جائے گی تمھاری۔"

" مجھے کون سا روگ ہوا ہے؟"

" یہی تو جاننا چاہتا ہوں میں۔"

شرد کے الفاظ میں چھپا ہوا کرب منجولا نے محسوس کر لیا، جان لیا۔ بے بسی اور دُکھ سے بھری آہیں اُس کے سینے میں جمع ہو گئیں، اُس کی آنکھیں بھر آئیں اور سارے بدن میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔ وہ لجاجت سے بولی" ناراض ہو گئے ہو تم۔ میں سمجھتی ہوں، لیکن قسم سے کہتی ہوں، مجھے لُطف نہیں آتا۔ خواہش ہی نہیں ہوتی۔"

" پہلے ہر بات اچھی لگتی تھی۔ آج کل تم اڑیل ہو گئی ہو۔ اب میں تمھیں اچھا نہیں لگتا۔"

منجولا کا چہرہ ایسا ہو گیا جیسے کہنا چاہتی ہو" اب کیا کہوں تم سے؟" پھر بھی وہ بول اٹھی" آپے سے باہر کیوں ہوتے ہو؟ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو!"

" سب سمجھتا...."

" میں تھک جاتی ہوں دوست! کھانا پکا کر، پانی بھر کے، روز کے آنے جانے کی دردسری سے، آفس کے ٹائپ رائٹر کے کارن...."

" میں نہیں تھکتا کیا؟ کیا میں کام نہیں کرتا؟ اور دنیا بھر کی عورتیں کام کرتی ہیں۔ کام کیا گنا رہی ہو۔ ایسا ہی ہے تو چھوڑ دو نوکری۔ لیکن یہ میں کیسے کہوں؟ میری ہی غریبی، کمزوری ننگی نہ ہو جائے گی..."

منجولا کے دل میں کھینچا تانی ہونے لگی۔ شرد کو کیسے سمجھائے؟ اپنے آپ کو کیوں کر منائے؟ آخر جی کڑا کر کے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی، آنکھیں نکالتی اور ہونٹ کاٹتی ہوئی۔

" کھڑکی مت بند کرو!" شرد چڑ کر چلّایا:" گرمی سے یوں ہی طبیعت گھبرا رہی ہے۔"

منجولا سہم گئی۔ کھڑکی سے دور ہٹتی ہوئی بولی "پڑوس کا مہمان جگہ کی تنگی کے سبب ہماری کھڑکی کے پاس کھٹیا ڈال کر سوتا ہے۔"

"رہنے دو، اور تم بھی روز کی طرح چپ چاپ سو جاؤ۔"

منجولا بھی چڑ گئی۔ آرام کرسی میں خود کو جھونک کر خاموش پڑی رہی۔ ڈراونا سناٹا اُس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ بولی "اگلے مہینے ہم سب سے پہلے ایک پنکھا خریدیں گے۔"

شرد بھیانک انداز میں ہنسا۔ بولا۔ "تو ایک مہینے کے لیے تمھیں چھٹکارا مل گیا، کیوں؟"

منجولا کا دماغ بھڑک اُٹھا۔ بڑے کڑوے لہجے میں بولی "یہ کیا بک رہے ہو؟"

شرد نے دگنی کڑواہٹ کے ساتھ جواب دیا "کیوں غلط کہہ رہا ہوں؟ کیا یہ جھوٹ ہے کہ ہمارے بیچ میاں بیوی کا سمبندھ باقی نہیں رہا۔؟"

"شرد! شرد!" منجولا غصے سے کانپنے لگی۔ پھر خود پر قابو پانے کی کوشش میں اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔

دوبارہ سناٹا چھا گیا لیکن صرف کمرے کی حد تک۔ باہر برتنوں اور جھگڑوں کی آوازوں اور فلمی گیتوں کے شور کا سلسلہ جاری تھا اور کمرے کی خاموشی کے ساتھ سنگت کر رہا تھا۔

شرد بستر چھوڑ کر اُٹھا اور آرام کرسی کے پائے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ منجولا نے ممتا بھرے انداز میں اس کے سر پر سے ہاتھ پھیرا۔ شرد نرمی سے بولا "ایسا برتاو کیوں کرتی ہو منجو؟ پہلے کتنی خوش خوش رہا کرتی تھیں تم! بھول گئیں ساری باتیں؟ شادی کے بعد تمھارے گاؤں میں گذارا ہوا ہفتہ یاد ہے؟ رات رات بھر جاگا کرتے تھے ہم دونوں! تم تو دن چڑھ آنے پر بھی کمرے سے نکلنے پر آمادہ نہیں ہوتی تھیں اور یہاں بھی یہ حال تھا کہ شام کو لوٹ آنے پر تم مجھ سے چمٹی رہا کرتی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔"

منجولا کو ہچکیاں روکنا دشوار ہو گیا۔ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بولی "یاد ہے دوست، سب کچھ یاد ہے۔ شرد میں بے حد پریم کرتی ہوں تم سے۔ تمھارے بنا نہیں رہ سکتی۔ میرا ۔ ۔ ۔ ۔"

شرد تیزی سے آگے بڑھا اور اُسے تسلی دیتا ہوا بولا "میں تو تمھارا ہی ہوں، تم ہی پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگی ہو۔ دیکھو اوروں کو یہ تنہائی بھی کہاں نصیب ہوتی ہے۔ جہاں دن دس آدمی ایک گھر میں رہتے ہیں وہاں جھانک کر تو دیکھو۔ اور مزدوروں کی حالت تو ۔ ۔ ۔ ۔ آخر ایسا کیوں کرتی ہو؟ میں جانتا

ہوں کہ شادی کے نئے نویلے دنوں کی کشش ہمیشہ باقی نہیں رہتی۔ پھر بھی . . . "

اُس کے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھام کر منجولا روتے ہوئے بولی " نئے نویلے دنوں کے بعد بھی تم مجھے اچھے لگتے ہو دوست۔ لیکن پسینے سے چپچپاتی ہوئی یہ دوڑ بھاگ، یہ مشینی زندگی مجھے راس نہیں آرہی۔ شرد چلو یہاں سے کہیں اور چلے جائیں۔ تم مجھے لے چلو، پہلے یہاں سے کہیں اور لے چلو . . . " اس کے الفاظ اور ہچکیاں اس ماحول میں گھٹ کر رہ گئیں۔

کافی دیر بعد شرد کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی " تم اُکتا چکی ہو . . . مجھے لگتا ہے تمھیں بچہ چاہیے "

" ہوسکتا ہے۔ لیکن بچہ ہونے والا ہوا تو میں یہاں ہرگز نہیں رہوں گی۔ میرے بچے کو ایسی . . جانے دو، اِس بحث سے کیا حاصل ؟ "

منجولا کے آنسو خشک ہو چلے تھے۔ شرد کا جوش بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔ دُرشت لہجے میں بولا۔ " حالات سے سمجھوتا نہیں کریں گے تو ہمیں کو دُکھ ہوگا۔ کیا مجھے پسند ہے یہ کھینچ تان ؟ لیکن کریں کیا؟ پھر دن بھر کی کوفت کے بعد تھک جانے پر تھکن اُتارنے کا یہی ایک راستہ رہ جاتا ہے۔ وہ بھی تم . . . "

شرد کے الفاظ سن کر منجولا کا کلیجا کٹ گیا۔ اسے کراہیت محسوس ہوئی، چڑ پیدا ہوگئی۔ اس کے شرد کو ایسا برتاو نہیں کرنا چاہیے، ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ اس کا جی چاہا ابھی اُٹھ کر کہیں دُور نکل جائے، بہت دُور . . . "

اتنے میں شرد نے اُسے اچانک کرسی سے نیچے گھسیٹ لیا۔ غصّے میں بُڑبُڑایا " مہینے بھر سے برداشت کر رہا ہوں۔ بہت عجیب ہوگئی ہو تم ! "

وہ نیچے آپڑی۔ شرد کی گرفت میں اُسے کوئی لطف محسوس نہیں ہوا۔ گرمی کے مارے دم اُور گھٹنے لگا۔ اُس کا گلے لگانا لوکل ٹرین میں چاروں طرف سے لگنے والے مردوں کے دھکّوں کی مانند تھا، اور بوسہ بھیڑ بھاڑ میں لی گئی چٹکی کی طرح۔

شرد نے چڑ کر اُسے دُور دھکیل دیا " جاؤ مرو ! "

منجولا کو لگا سچ مچ اُسے موت آجائے تو اچھا۔ اپنے محبوب، اپنے شوہر کے ساتھ چلنے کی سکت بھی نہیں رہی اس میں۔ اُسے خود سے نفرت ہونے لگی۔ اب اور کن معاملوں میں اپنی پسند و ناپسند، اپنے

خیالات و جذبات کا جنازہ نکلنا باقی رہا ہے؟ پھر اتنی سی بات کے لیے ضد کیوں؟ کیا ان گنت عورتیں چُپ چاپ اپنے من کو نہیں مارتی رہتیں؟ خود اس کا شرد بھی تو یہی کر رہا ہے۔ بے کل ہو کر اس نے بے اختیار آواز دی۔

"آؤ نا، لوٹ نا۔"

"لاش کے ساتھ سمبھوگ نہیں کر سکتا میں۔" اُس نے تلخ ہو کر جواب دیا اور اُٹھ گیا۔ "آج سے تمھارا میرا رشتہ ختم۔ تم نے خود مجھے اپنے سے دُور کر دیا ہے۔ تم رہ سکتی ہو اس طرح پر میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔ میں اپنا سُکھ آپ تلاش کر لوں گا، تمھارے نخرے نہیں چاہئیں۔ جا رہا ہوں میں۔"

منجولا کے آنسو خشک ہو گئے۔ پیشانی شکنوں سے بھر گئی۔ بھڑک کر چلا اُٹھی وہ۔ "جاؤ، جاؤ .... جہاں جی چاہے جاؤ!"

"تمھارے باپ کا ڈر نہیں ہے۔"

"لو اُس پرس میں پیسے ہیں، اور چاہئیں تو لے جاؤ۔" منجولا کا غصّہ بے قابو ہو رہا تھا۔ اُسے لگا اس کا سر پھٹ جائے گا، یا سارا بدن سلگ اُٹھے گا۔

پھر اچانک اُسے کسی خوف نے آ گھیرا۔ دلی کوفت اور رنج مل کر اُسے بے ہوش کرنے لگے غصّے اور غم کی کشمکش نے اس کی حالت قابلِ رحم بنا دی۔ بے انتہا کوشش کے بعد ہی وہ خود پر قابو پا سکی، سرکتی ہوئی آگے بڑھی اور ٹٹولتے ہوئے شرد کے پیر پکڑ کر بولی "معاف کر دو، مجھ پر دَیا کرو۔ مجھے سمجھو۔ تمھارا وجود مجھے چاہیے لیکن ...."

شرد ہونٹ چباتا ہوا آرام کرسی کی طرف بڑھا اور اُس پر لٹھ کی طرح دھم سے گر کر سگریٹ سلگانے لگا۔ منجولا بڑی رقّت کے ساتھ اس کی جانب سرکی اور دردمندی سے بولی "کیسے سمجھاؤں تمھیں؟ میرے تصوّرات بالکل الگ، ایک دم مختلف ہیں دوست! رُوح مسرُور ہو، جسم کھلا کھلا ہو، صاف ستھرا اور خوبصورت ماحول ہو تو ہی میرے جذبات پھلتے پھولتے ہیں۔ یہاں اس پاس شور، آمد و رفت جاری رہتی ہے، رونا چلانا، گالم گلوج سُن کر طبیعت مالش کرنے لگتی ہے پسینا بہتا رہتا ہے، پسّو کاٹتے رہتے ہیں، بدن چوُر اور سر بھاری رہتا ہے۔ ہر روز باسی بریڈ کے ٹکڑے، لوکل ٹرین میں بھوکی نگاہیں اور آفس کے ٹائپ رائٹر کی کھٹ کھٹ —— اِن سب سے

دماغ کو تکلیف پہنچتی رہتی ہے اور پھر دل ایک دم مُرجھا جاتا ہے، جسم آمادہ نہیں ہوتا۔ چاروں طرف یہ عمل گھناونا روپ لیتا جارہا ہے۔ حیوانوں کی طرح۔ لیکن مجھے حیوان نہیں بننا ہے۔ میں اپنے جذبات، اپنی خواہشات کی حفاظت کرتی ہوں، اُنہیں پوتر مانتی ہوں۔ کم از کم اِس تحفّظ سے تو مجھے محروم نہ کرو۔ مجھے بے عزّت نہ کرو شرد، مجھے بے عزّت نہ کرو۔"

منجولا کے ادھورے شبد کب ختم ہوئے، خود اُسے بھی پتا نہیں چلا۔ ہچکیوں کے سیلاب میں پگھل کر بہہ گئے۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی دھماکے کے ساتھ پھٹنا چاہتی تھی اور آنکھیں سلگ رہی تھیں۔ لوکل ٹرین کے مرد پُشت کی جانب سے دھکّے دے رہے تھے اور واسنا بھری نظروں سے گھور رہے تھے۔ راستہ چلتوں کے فحش الفاظ اور چال کے بے شمار بچے مل کر اُس کے اِرد گِرد ناچ رہے تھے۔ پسّو کاٹ رہے تھے، پسینا بہہ رہا تھا اور شرد کی گود میں سر رکھے ہوئے وہ نیند کی آغوش میں سماتی جارہی تھی۔

پ ۔ بھا ۔ بھاوے

موہ

میں جب اپنے دوستوں کو یہ واقعہ سُناتا ہوں تو اُن میں سے اکثر اس کے اصل حصّے پر یقین ہی نہیں کرتے۔ اِس بات پر اعتبار لانے کو تو وہ دل سے راضی ہوتے ہیں کہ اُس کا برتاو ویسا ہی رہا ہوگا جیسا میں بیان کرتا ہوں لیکن اِس پر اُنھیں قطعی یقین نہیں آتا کہ میرا برتاو بھی میرے بیان کے مطابق ہی رہا ہوگا۔ دبی زبان سے سُنائے ہوئے اِس قسم کے قصّوں کو سُننے کے لیے جس تجسّس کی ضرورت ہوتی ہے، اُتنے ہی تجسّس کے ساتھ اُس شام کی واردات سُن لینے کے بعد وہ گردن ترچھی کرکے کچھ ایسی خباثت اپنے چہرے پر لے آتے ہیں کہ مجھے اُن کے دلی مقصد کے بارے میں کوئی شبہ ہی نہیں رہ جاتا۔ میرے بعض دوستوں کو میری کہانی ناقابل یقین تو نہیں لگتی لیکن اُنھیں میرا اُس دن کا برتاو انتہائی احمقانہ لگتا ہے۔ اِس بات پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہ میری جگہ وہ خود نہیں تھے، وہ مجھ سے کہتے ہیں" ارے زندگی میں کبھی نہ حاصل ہونے والا ایسا سنہری موقع، اور تم نے کھودیا۔ کیا آدمی ہو تم بھی!"

عورتوں کے حد سے گزر جانے کے قصّے میں نے بہت سُن رکھے تھے لیکن اُس دن سے پہلے اِس قسم کے برتاو کا مشاہدہ کرنے کا موقع مجھے کبھی نہیں ملا تھا۔ دوستوں کے حلقے میں بیٹھ کر اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہوئے آوارگی میں ہم بھی کچھ کم نہیں، اِس بات کا سکّہ جمانے کا ہوکا مجھے بھی ہے۔ اِسی لیے کچھ دوست مجھے ڈھونگی تو کچھ بے وقوف کہتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اوّل درجے کے گناہ کے سلسلے میں میرے خون ہی میں پرہیز اور خوف سمایا ہوا ہے۔ بچپن ہی سے میں نے کچھ شریف لوگوں کی آنکھیں دیکھی ہیں، کچھ اچھی کتابیں پڑھی ہیں اور اُن کی تعلیمات کو یکسر بھلا

دینا میرے لیے اب تک ممکن نہیں ہو سکا ہے۔

اُس شام میں نے جو کچھ کیا اور جو کچھ نہیں کر سکا، اُس کے لیے اکثر مجھے دلی بے چینی کا احساس ہوتا ہے۔ مجھے پتا ہے کہ عقلی بحث کرنے والا کوئی پروفیسر یا مُدیر مجھ جیسا برتاؤ ہرگز نہ کرتا۔ لیکن اِنٹر سائنس پاس کر لینے کے بعد میں نے ماہم میں ایک چھوٹا سا دھندا شروع کیا اور اُس دن سے عقلیت پسندی سے میرا ناتا ہی ٹوٹ گیا۔ گناہ کا موہ سامنے آتے ہی تحفظ پسندی کے تحت فوراً وہاں سے راہِ فرار اختیار کرنے کی میری عادت تب سے اور بھی پکّی ہو گئی۔ سارے پروفیسروں اور ادیبوں کو یاد کر کے میں جب گناہ کی دہلیز پر ٹھٹکتا، ڈگمگاتا اور گناہ کا پکّا ارادہ کر کے واپس لوٹتا ہوں، تب تک موقع ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔ ایک دم اچانک اُلٹی سیدھی پینگیں لینے والا دل کا پنڈولم تھم چکا ہوتا ہے۔ پہلے تو میں خود موہ سے گھبرا کر دُور بھاگتا ہوں، پھر موہ خود مجھ سے اُکتا کر دُور بھاگ جاتا ہے۔

آج تک میں اسی طرح محفوظ رہ پایا ہوں۔ اُس دن بھی یہی ہوا۔

اِنٹر سائنس تک تو میں اور وِسوُ ہم جماعت رہے ہی تھے، اپنے اپنے میدان میں ابتدائی کاروباری جدوجہد کے دوران ہم سائگی و دوستی کے فرائض کی ادائیگی میں باہم ایک دوسرے کو دلاسہ دینے کا عہد بھی ہم ایک عرصے سے نبھا رہے تھے۔ پھر وِسوُ کا دواخانہ ماہم میں نہ چل سکا اور گانو دیوی کو منتقل ہو گیا۔ البتہ میرا "اچار لمیٹیڈ" کا کارخانہ ماہم میں چل نکلا۔ تب سے اُس کی اور میری ملاقاتوں اور گپ شپ میں کھنڈت پڑنے لگی۔ ماہم میں وِسوُ کی ناکامی کے بعد اُس کے گانو دیوی منتقل ہونے سے قبل ہفتے میں کم از کم ایک بار ملاقات کا معاہدہ ہم نے کیا تھا۔ کچھ دنوں تک تو طرفین نے اس معاہدے کی پابندی کی۔ پھر فتحیابی کے لیے تیرھویں بلٹن کو میرے کارخانے کے خاص اچار مہیا کرنے کا کنٹریکٹ مجھے ملا اور میرے لیے دم لینے کی فرصت نکالنا محال ہو گیا۔ اب مجھے بھرپور پیسے ملنے لگے۔ لیکن باہر کی دنیا سے میرا اسمبندھ گویا ٹوٹ ہی گیا اور میں "اچار لمیٹیڈ" میں پوری طرح رم گیا۔

معاہدہ توڑنے پر گالیاں دینے کے لیے وِسوُ چند ہفتے میرے ہاں پابندی سے آتا رہا پھر اس کا آنا بھی رفتہ رفتہ بند ہو گیا۔ مجھے لگا اس کا دھندا بھی اب چل نکلا ہوگا اور کافی مہینوں

بعد جب وہ ایک دن مجھے بس میں ملا تو اس نے بتایا کہ اُس کی ڈاکٹری خوب چل رہی ہے۔ دھندے کی لکیر پر میری زندگی کی گاڑی سیدھی چلی جا رہی تھی۔ سپر ٹیکس بچانے کے لیے اپنے اچاروں کے اشتہارات پر میں خوب پیسا خرچ کیا کرتا تھا۔ غالباً میری کامیابی کی اس شہرت کے نتیجے میں میرے وجود کا نوٹس تک نہ لینے والے میرے بہت سے پُرانے دوست اب میرے آفس پر میرے ساتھ گپ شپ کرنے کے لیے آنے لگے۔ اُن میں سے کوئی بے غرض خدمتِ خلق کے نظریے کے تحت چلائے جانے والے کالج کے پروفیسر تھے تو کوئی فلموں کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے تو کوئی کسی نہ بکنے والے ہفتہ وار کے مُدیر تھے۔ اُن میں سے ہر ایک کو سو پچاس روپیوں کا قرض اور اچار کا نمونہ دینے میں میں نے ذرا بھی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا تھا۔ اس کے عوض وہ میری تعریف کر کے نت نئی دلکش و رنگین باتیں مجھے سنایا کرتے اور کافی دیر تک میرا دل بہلانے کے بعد پُر امید انداز میں مجھ سے شادی یا گناہ کرنے پر اصرار کرنے لگتے۔

میں بھی گپ ہانکنے میں اُن سے پیچھے نہیں تھا۔ اپنے خیالی عشق کی گرما گرم داستانیں سُنا کر میں بھی اُنھیں ایک دم ٹھنڈا کر دیا کرتا تھا۔ گناہ کے لیے میرے من میں بھی موہ تو تھا، اور میں نے سُن رکھا تھا کہ پیسے سے دنیا میں ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔ پھر بھی پیسے کمائے جائیں اور زیادہ سے زیادہ پیسے کما کر اُن سے مزید کیریاں، لِکمروندے، ٹماٹر اور امرود خریدے جائیں، اس سے بڑے پیسوں کا استعمال میں نہیں جانتا تھا۔ میں اور عورتیں اِن دونوں کا اچار سے قریبی تعلق ہونے کے باوجود اچار کے رِمنہا کر لینے پر میرا کسی بھی عورت سے کسی قسم کا گٹھ جوڑ نہیں ہوا تھا۔ اپنے کاروبار میں مَیں سب سے آگے تھا مگر صنفِ نازک سے متعلق نازک نفسیات کے میدان میں ایک دم پھسڈی تھا۔ محض گپ بازی اور تخیّل پرستی سے جذباتی بھوک مٹاتے مٹاتے میں بھی تنگ آگیا تھا مگر اس کا کوئی علاج نہ تھا۔ اِس قسم کے 'دھندے' کرنے کے لیے اپنا پھیلتا ہوا کاروبار ترک کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا اور میرا کاروبار ہی ڈوب جائے تو پھر میرے لیے دوسری باتیں بھی ناممکن ہو جائیں گی؛ یہ مجھے معلوم تھا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ میں اپنی حالت سے ناخوش تھا لیکن اکثر اِس بات پر مجھے افسوس ضرور ہوتا تھا کہ میری کوئی سماجی زندگی نہیں تھی۔ آج بھی مجھے ملنے والی بے حد و حساب دولت، اپنی جکڑ بندیوں اور یکسانیت

کی شکار زندگی اور مرتبانوں کے کارخانے کی شروعات کے بارے میں بڑی بے دلی ہی سے سوچ رہا تھا کہ اتنے میں مہینوں بعد وِسوٗ کا فوری فون آیا۔

"کیا کر رہے ہو؟" اُس نے پوچھا۔

"تِلملا رہا ہوں"۔ میں نے جواب دیا۔

"بس اتنا ہی؟"

"نہیں! مرتبانوں کے کارخانے کے بارے میں بھی سوچ رہا ہوں"۔

"دیکھو فی الحال اچار اور سوچ بچار دونوں کے مرتبان بند کر دو"۔

"اور کیا کروں؟"

"آج شام کو میرے ہاں کھانے پر آو"۔

"شام کو؟ لیکن شام کو میرے ہاں ..."

"قطعی آنا ہے"۔ میرا آخری لفظ ادا ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑا۔

"ٹھیک ہے"۔ میں نے کہا۔

"طے!"۔

جنگِ عظیم کے بعد اپنے اچار زیادہ سے زیادہ مقدار میں ہندوستانیوں کے گلے سے اُتارنے کے لیے چلائی گئی مہم کے ایک حصّے کے طور پر مجھے نانا چوک اور کھوٹے فٹ پاتھ کے پاس اشتہار لگانے کے لیے دو دیواریں دیکھنا تھیں۔ اُن کا معائنہ کر کے میں ہاروے روڈ پر اُتر پڑا اور وِسوٗ کے گھر پر لگی اُس کے نام کی تختی پڑھتے ہوئے میں نے کال بیل کے بٹن پر اپنی اُنگلی دبا دی۔ ایک منٹ تک میں گھنٹی بجاتا ہی رہا تب کہیں دروازے کے پیچھے سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سُنائی دی اور دروازہ کھُلنے کے بجائے اُس پر لگی جالی کے پیچھے کی چِکتی سرکائی گئی اور جالی میں سے دو آنکھیں مجھے گھُورنے لگیں۔ وہ آنکھیں وِسوٗ کی نہیں تھیں اور نہ ہی بھابی کی تھیں۔ وِسوٗ کی آنکھیں کرنجی ہیں۔ جالی کے پیچھے سے میرے کسی زمانے میں نہایت تر و تازہ لگنے والے چہرے پر مرکوز ہو جانے والی وہ آنکھیں کاجل سی کالی تھیں۔ وہ آنکھیں ضرورت سے زیادہ دیر تک مجھ پر ٹکی رہیں۔ مجھے لگا کہ ان آنکھوں

سے وہی بے جھجک جذبات جھلک رہے ہیں جو کسی کی لاعلمی میں اُسے دیکھنے والے کی آنکھوں میں تیرنے لگتے ہوں گے۔ کسی کے جسم کا کوئی حصّہ نظر نہ آئے اور صرف آنکھیں اُسے گھورتی دکھائی دیں اور وہ آنکھیں بھی کسی انجان عورت کی ہیں اس کا یقین دل کو ہو جائے تو آدمی کو بڑا عجیب سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ کاجل کی اُن اتھاہ جھیلوں پر میری نگاہیں بھی کچھ دیر کے لیے ٹکی رہیں اور پھر اندر سے چوڑیوں کی کھنک اور بولٹ سرکاتے کی آواز کے ساتھ دروازہ کھول دیا گیا۔ میرے سامنے نہائی ہوئی اور اپنے بالوں کو سفید براق کپڑے میں لپیٹے ہوئے ایک نوجوان عورت کھڑی تھی اور مجھ سے کہہ رہی تھی۔

"میں غسل خانے میں تھی، اس لیے دروازہ کھولنے میں کچھ دیر لگ گئی۔"

موتیا کے رنگ کی، کہیں کہیں بھیگی ہوئی پانچ گزی ساڑی، غسل کے بعد زیادہ ہی نکھری ہوئی جلد، گلاب کے گچھے پر بیٹھے ہوئے بھنگوں کی سی سیاہ آنکھیں اور ویسے ہی بالوں کا سفید کپڑے میں جوں توں کر کے چھپایا ہوا بھرپور خزانہ۔ میری آنکھوں نے بڑی تیزی سے اپنا فرض ادا کیا۔ میرے مشام کو کسی عمدہ صابن کی خوشبو نے متاثر کیا اور میرے دل نے مجھ سے کہا "اس لڑکی کو اس سے قبل میں نے وِسو کے ہاں کبھی نہیں دیکھا۔"

"اندر آئیے نا!" وہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔

"وِسو کہاں ہے۔" میں نے قدرے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"کھار گئے ہیں، اُن کے ایک دوست حادثے کا شکار ہو گئے ہیں۔ میاں بیوی دونوں ہی گئے ہیں۔"

"یعنی گھر میں کوئی نہیں؟"

"میں جو ہوں۔ مجھے کیوں کوئی میں شمار نہیں کرتے آپ؟"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر یا جھجک نہیں تھی۔ جب میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا بات کروں تو میں سامنے آئینے کی طرف دیکھنے لگا۔ میں یقیناً کسی "اچار لمیٹڈ" سے متعلق آدمی جیسا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے دوبارہ اُس کی طرف دیکھا۔ مجھ پر ٹکی ہوئی نظریں وہ جلدی سے ہٹاتی ہوئی مجھے نظر آئی۔ اُس کی

بدلی ہوئی نظروں میں بھی مجھے ایک غیر معمولی روشنی کی چمک دکھائی دی۔ اپنے لہجے کو ممکنہ حد تک کاروباری اور چہرے کو ممکنہ حد تک پتھریلا بناتے ہوئے میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں"

"چائے پیے بنا ہی۔؟"

"جی ہاں۔"

"اپنے لیے چھوڑا ہوا پیغام بھی نہیں پڑھیں گے۔ آپ کے لیے وِشواس راو نے ایک خط لکھ چھوڑا ہے۔"

"دیکھیں۔"

وہ تیزی سے نکل کر اندر چلی گئی۔ اُس کے جوان اعضا انتہائی صحت مند تھے پھر بھی اُس کی چال ڈھال ایک لپکتی ہوئی ہرنی کی طرح چنچل تھی۔

"میں نے چائے چڑھا دی ہے"۔ میرے ہاتھ میں چٹھی دیتے ہوئے وہ چڑانے والے انداز میں بولی۔

جلدی میں گھسیٹی ہوئی وِسو کی چٹھی میں میرے سامنے کھڑی جوان لڑکی کا ذکر محض "بیوی کی مہمان" کے طور پر کیا گیا تھا اور کھار کے اپنے دوست کا ٹیلی فون نمبر درج کر کے ناگہانی طور پر ملاقات نہ ہو سکنے پر افسوس ظاہر کیا گیا تھا اور پھر تاکید کرتے ہوئے اُس نے لکھا تھا کہ میں بغیر کسی جھجک کے گھر پر اُس کا تھوڑی دیر انتظار کر لوں۔ میں بڑی آہستگی سے اس چٹھی کی آڑی ترچھی تہیں کرنے میں لگا ہوا تھا کہ اس لڑکی نے شیشے کی ایک چھوٹی سی میز پر چائے کی دو پیالیاں لا کے رکھ دیں اور کرسی کھینچ کر خود بھی میرے سامنے بیٹھ گئی۔

"آپ آئیں تو آپ کا ٹھیک سے سواگت کرنے کی تاکید کی تھی ڈاکٹر صاحب نے۔ اور آپ ہیں کہ پرائے پن کے ساتھ جھجک رہے ہیں۔" وہ بولی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے"۔ میں نے جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

اُسی لمحے میز کے نیچے اس کے پیر میرے پیروں کو چھونے لگے اور اس سے پہلے کہ میں

سنبھل کر بیٹھ جاؤں، چائے کی پیالی میرے سیدھے ہاتھ سے پھسل کر اُلٹے ہاتھ پر اوندھی گر پڑی۔ میری سمجھ میں سارا حادثہ آنے سے قبل اُس نے "اوئی ماں، ہاتھ جل گیا" کہہ کر کرسی چھوڑ دی اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر وہ اسے رومال سے پونچھنے لگی۔

میرے ذہن پر بیک وقت اندھیرا اور اُجالا چھا گیا اور میرا دل بیک وقت خبردار اور بے خبر ہوتا گیا۔ اُس کے چہرے پر اب بھی کوئی خاص تبدیلی دکھائی نہیں دی۔ لیکن اس کی آنکھوں کی چمک بے انتہا بڑھ چکی تھی اور اُس کے ہاتھ کی بڑھتی جانے والی گرفت کا مطلب بہت صاف تھا۔ اِس گرفت کو ہٹانے کی ایک کمزور سی خواہش میرے دل میں تھی، لیکن اس گرفت کو ایک دم سے دُور کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ کانپتے ہوئے لہجے میں میں نے کہا۔

"وِسو کو فون کر کے دیکھتا ہوں۔"

"ہوں"۔ ہونٹ کو دانتوں تلے دبا کر، ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولی۔ اور میں نے اس کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ چھُڑا لیا۔

نمبر ڈایل کر کے میں نے رِسیور کو کان لگایا اور وِسو کیا کہتا ہے یہ سُننے کے بہانے سے وہ مجھ سے بالکل سٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے بدن کی خوشبو میری ناک میں پہنچ رہی تھی اور اُس کی سانسیں کسی پَر کی طرح میرے گالوں کو چھو رہی تھیں۔

"ہیلو، ہیلو، وِسو"۔ میں ہانپتا ہوا بولا۔

اب وہ مجھ سے اور بھی چمٹ کر کھڑی ہو گئی تھی اور اس کا چہرہ میرے چہرے سے اور بھی قریب ہو گیا تھا۔

"سُنو بابو، Nothing very serious لیکن آج کی رات ہم دونوں کو یہیں ....." وِسو کی آواز قدرے دھیمی پڑ گئی اور اس نے کسی سے دریافت کیا "تو پھر طے ہو گیا نا؟" اور میری چھاتی کی دھپ دھپ کے درمیان اُس نے کہا "آج کی رات یہیں رہنا لازم ہے۔"

میں نے رِسیور نیچے رکھ کر گردن اُٹھائی۔ اتنے میں خوشبودار نم ریشم کی دھاریں ماتھے پر بکھر گئیں۔ اس کی ایک بے چین حرکت کے نتیجے میں اس کے بال کھُل گئے تھے اور بکھرے ہوئے

پستول کے سے لہجے میں وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔" آج رات کو وہ دونوں کبھی نہیں آئیں گے یہاں؟"

وہ اب تک مجھ سے سٹ کر کھڑی تھی۔ میرے سارے بدن سے شعلے پھوٹ رہے تھے۔ جسم لرزنے لگا تھا۔ وہ لمحہ انتہائی موہ کا تھا اس کا مجھے احساس ہو چکا تھا۔ میرے دوست کی بیوی کی مہان سارے حدود توڑ کر مجھے بھر مار رہی تھی۔ کالج میں ایک ساتھ کھینچی ہوئی ہم دونوں کی تصویر سامنے کی دیوار پر سے میری مدہوشی کا نظارہ کر رہی تھی۔ جس لمحے مجھے احساس ہوا کہ میرا موہ اپنی چوٹی کو پہنچ چکا ہے، اُسی لمحے گناہوں سے دُور بھاگنے والی میری تحفظ پسندی جاگ اٹھی اور اُسے باہوں میں لینے کے لیے پھیلائے ہوئے ہاتھوں ہی سے اُسے دُور دھکیل کر میں دروازے تک پہنچ گیا۔

لیکن بجلی کی سی سرعت سے وہ مجھ سے پہلے دروازے تک پہنچ چکی تھی اور دروازے کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھ کر عجیب ڈھنگ سے چکنے والی آنکھوں کے ساتھ مجھ سے کہہ رہی تھی۔

"آپ کھانا کھائے بنا ہی چلے جائیں گے؟"

"ہاں۔"

"بادل گھر آئے ہیں، راستے میں بھیگ جائیں گے۔"

"مجھے جانا ہی ہوگا۔"

"یہاں مجھے بڑا اکیلاپن محسوس ہوگا۔"

"لیکن مجھے جانا ہی ہوگا۔"

میری قوت سے پرے کی کٹھورتا کے ساتھ میں بول رہا تھا۔ یہ سب کہتے ہوئے میری جان تک ہانپ رہی تھی۔ دروازے کی چوکھٹ پر سے ہاتھ ہٹائے بغیر آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ دو چار لمحے میری طرف یوں ہی دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں شعلے آخری مرتبہ لپکے، اس کے نازک نتھنے ہلکے سے کپکپائے اور پھر اس کی نظریں سرد ہو گئیں۔ ملول انداز میں اس کا ہاتھ چوکھٹ پر سے نیچے سرکا اور ایک لفظ کہے بغیر اُس نے دروازے کے بولٹ پر انگلی دباتے ہوئے اسے نیچے کھینچ لیا۔

اُس حسین عمارت کی ایک مخصوص کھڑکی سے آنے والی روشنی کی طرف دیکھتا ہوا میں نیچے راستے پر بُت بنا کھڑا تھا۔ آسمان میں بادل اُمڈ آئے تھے، ٹھنڈی ٹھنڈی تیز ہوائیں چلنے لگی تھیں پھر بھی میرا بدن جل رہا تھا۔ میں نے جو کچھ کہا اور جو برتاو کیا اُس کا ردِ عمل میرے دل پر شروع ہو چکا تھا۔ اُس کے صحت مند بھرے بھرے جسم کی کھڑکی کے پردے پر اُبھرتی اور پھسلتی ہوئی پرچھائیں مجھے رہ رہ کر نظر آرہی تھی۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ شام اب رات میں ڈھل رہی تھی۔ اور راستے کی بتیاں مزید روشن ہوتی جارہی تھیں۔ اُس کی پرچھائیں کی چند اور حرکات میں نے پردے پر دیکھیں اور میرے بے قابو من نے بالکل مخالف سمت میں پینگ لی۔ تیر کی طرح میں دوبارہ اس عمارت میں گھُس گیا، جوش کے ساتھ دو منزلے طے کیے اور کال بیل کے بٹن پر اُنگلی دبائے رہا۔

اُس نے دوبارہ دروازہ کھولا اور ذرا سی بھی حیرت یا خوشی کا اظہار کیے بغیر سنگریزے کی نظروں سے گردن اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس نظر سے میں محجوب سا ہو گیا اور جھجکتے ہوئے بولا "Sorry to disturb you لیکن مجھے لگتا ہے میں اپنا رومال یہاں بھُول گیا ہوں۔"

میرا رُومال تلاش کرنے کے لیے اُس نے اندر کو دوڑ نہیں لگائی۔ وہ رومال مجھے واپس کرنے کے بہانے میرے ہاتھوں کو چھُو لینے کا موہ اُسے نہیں ہوا۔ یہ تو لمحات کے کھیل ہوتے ہیں۔ اُس کے من نے بھی اب ایک دم اُلٹی پینگ لے لی تھی۔ اطمینان کے ساتھ وہ دروازے میں سے ایک طرف کو ہٹی اور میز پر پڑے بچر مرائے رومال کی طرف اس نے انگلی سے اشارہ کر دیا۔ میں بلا وجہ ہی اس کمرے میں منٹ بھر کے لیے رُکا رہا اور وہ پتھر کے مجسمے کی طرح مجھ سے دُور کھڑی رہی۔

رومال تہہ کر کے جیب میں رکھنے کے بہانے سے میں کچھ دیر اور رُک گیا اور اس کی پیشانی پر بل پڑنے لگے۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہی صرف پانچ منٹ قبل ایک دم تنے ہوئے میرے اعضا بالکل ٹھنڈے پڑ گئے اور مجھے پسینا چھوٹنے لگا۔ تیزی سے حملہ کیے جانے پر پسپا ہو جانے والے وحشی جانور کی طرح پیچھے ہٹتے ہوئے میں نے دروازے تک پہنچ کر اسے کھولا

اور سیڑھیاں اُترنے لگا۔ میرے حلق میں عجیب سا محسوس ہو رہا تھا اور میری پشت پر گویا آنکھیں اُگ آئی تھیں۔ میرے پہلا زینہ اُترنے تک وہ اسی طرح بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ پھر وہ تیزی سے دروازے تک آئی اور دانت ہونٹ کاٹتے ہوئے اُس نے دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔

میرے موہ اور میری حماقت کا ڈھنڈورا پیٹنے والی اُس کی بازگشت نہ جانے کتنی دیر تک میرے کانوں میں گونجتی رہی۔

وینکٹیش ماڈگول کر

ٹکراو

حسن مومن کے دو لڑکے بمبئی میں انڈے بیچنے کا دھندا کرتے تھے۔ گانو میں' مومنوں' کا بس ایک ہی گھر تھا۔ حال ہی میں حسن کا انتقال ہوا تھا اور اُس کی بوڑھی ماں حسن کے تیسرے بیٹے کے ہاتھوں میں گھر کا سارا انتظام سونپ کر خاموشی سے زندگی کے دن پورے کر رہی تھی۔

بمبئی میں کمائے ہوئے دھن سے بیٹوں نے زمینیں خرید لی تھیں جن میں سے ایک اراضی بوڑھے بابو پٹیل کی بیوہ بھابی کی تھی۔ بھابی نے زمین اُسے نہ بیچتے ہوئے' مومنوں' کے ہاتھ فروخت کر دی تھی، اس پر بابو کے دل میں کافی دنوں سے غصّہ پل رہا تھا۔ عمر کے ہاتھوں تھکا ہوا یہ شخص ہاڑ پیر کے اعتبار سے کسی بیل سے کم نہ تھا۔ اُس کا سر اور مُنہ جسم کے تناسب سے چھوٹے تھے، کندھے گاڑی کے جُوئے کی طرح چوڑے تھے اور رانوں سے نیچے پیر پتلے تھے۔ بظاہر اُس کا برتاو اسکول ماسٹر کی طرح نرم اور خاکسارانہ تھا مگر یہ محض دکھاوا تھا۔ بگڑ جانے پر وہ نہایت بدتمیزی اور تلخی سے پیش آتا۔

اُس کے جبڑے کے نچلے دانت زبان سے ٹھیلنے پر اپنی جگہ سے ہلنے لگتے تھے۔ اُن کی جڑیں شاید کھوکھلی ہو چکی تھیں مگر وہ پوری طرح گرے نہیں تھے۔ اِس لیے بابو بولتے وقت تُتلانے لگتا تھا۔ سارے گانو میں اپنے مرکھنے پن کے لیے مشہور اُس کے بیل اپنے مالک کے غُصیلے بول سُنتے ہی تھر تھر کانپنے لگتے اور ڈر کے مارے منہ کھول دیتے تھے۔

اپنے چھوٹے لڑکے بنڈا کو بابو نے چھوہارے اور کھوپرا کھلا کر اور راتب کا دُودھ پلا کر خوب مسٹنڈ بنا دیا تھا۔ بابو کی دلی خواہش تھی کہ اس کے بعد یہ لڑکا گانو والوں پر اپنی دھاک جمائے اور اُسے دیکھ کر شیر بھی لید کرنے لگے۔ فولادی پٹّی کی طرح کمائے ہوئے بدن والا یہ لڑکا کُشتی خوب کھیلتا تھا۔

گانو میں اُس کی ٹکر کا کوئی پہلوان نہ تھا۔ کھیتی باڑی کا کام نمٹا کر وہ روزانہ کسرت کیا کرتا۔ گیرو سے بدن کو رنگ کر ایک دم لال کر لیتا اور شام کو گانو کی نہر پر بالو میں برابر کے لڑکوں کے ساتھ خم ٹھونکا کرتا۔

ایک بار حسن کے لڑکے بمبئی سے اپنے گانو آئے ہوئے تھے کہ لاس گانو کا ایک مہمان اُن سے ملنے آ گیا۔ مومن کے لڑکوں کی بہن اس سے بیاہی ہوئی تھی۔ شام کے وقت مہمان کو لے کر دونوں لڑکے گنّے کے کھیتوں کو نکل گئے اور واپسی میں انھوں نے بابو کے بنڈا کو نہر کے کنارے بالو میں کھڑے ہو کر خم ٹھونکتے ہوئے دیکھا۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں بنڈا کا بدن تپے ہوئے لوہے کی طرح دمک رہا تھا۔

مہمان نے پوچھا "رسول، کس کا چھوکرا ہے رے او؟"

"بابو پٹیل کا۔"

"کشتی اچھی کھیلتا ہے کیا؟"

"ہاں تو! ارے یار گانو میں جوڑ نہیں ہے اُس کو۔"

یہ سنتے ہی مہمان کے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکنے لگیں۔ وہ بھی اچھا کشتی باز تھا۔ بکرے کا گوشت کھا کھا کے اُس نے بھی زور کمایا تھا۔ بالو میں اُتر کر وہ بنڈا کے پاس آیا اور اُسے دعوت دی۔

"ہمارے ساتھ لڑیں گے کیا پٹیل؟"

اُنگلی سے ماتھے کا پسینا پونچھتے ہوئے بنڈا نے اِس نئے اُستاد کو سر سے پیر تک نہارا۔ چوکڑی دار لنگی، بدن پر پتلی ململ کی قمیص، سر پر سجیلی پگڑی، مُڑے ہوئے کان، گلے میں تعویذ اور کلائی میں گنڈا۔

کمر میں گھسی جانے والی لانگھ کو اُنگلی سے ڈھیلی کرتے ہوئے بنڈا نے زور سے پوچھا "کون ہے رے یے؟"

بمبئی سے آیا ہوا لڑکا آگے بڑھا اور بولا "میمان ہے لاس گانو کا۔ ہمارے گھر بلو آیا ہے کچھ روز کو۔ ہماری بھین دی ہے اس کو۔"

بنڈا نے ایک مرتبہ مہمان کو آنکا اور مٹھی میں بالو اٹھاتے ہوئے بولا "اُتار کپڑے! ہو جائیں دو داؤ پینچ۔"

مہمان نے لنگی کھول دی، قمیص اُتاری۔ کھوپرے کا تیل جذب کیا ہوا اُس کا بدن شیشم کی مانند لگ رہا تھا۔ بازوؤں کے مینڈک خوب اُبھرے ہوئے تھے اور رانوں کے پٹھے تنے ہوئے تھے۔

گانو کے بچے بالے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ مقابلہ زوردار ہونے والا تھا۔ جیسے کو تیسا مقابل مل گیا تھا اور یہ کُشتی جیتتے ہی بنڈا کا نام لاس گانو کے اکھاڑے تک پہنچنے والا تھا۔ اپنے اُتارے ہوئے کپڑے سنبھالنے والے لڑکے کے کان میں بنڈا نے کہا "ہڈیاں توڑ کے مہمان کے ہاتھوں میں رکھ دوں گا۔"

لیکن سلامی ہوئی اور ایک ہی جھٹکے میں مہمان بنڈا کی پُشت پر تھا۔ ہاتھ مروڑ کر اُس نے بنڈا کو گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور کر دیا۔ پھر زمین کے ساتھ دبائے رکھا۔ طاقت میں دہنے مہمان نے بنڈا کو محض دبا دبا کر ہی گویا چیں بُلوا دی۔ ریت میں بُری طرح رگیدا۔ بالوں میں، منہ میں اور ناک میں بالو بھر جانے پر بنڈا چھٹپٹانے لگا، ریت کے موٹے موٹے کنکروں نے اُس کے گھٹنے چھیل دیے۔ اس کے باوجود وہ زور لگا کر اُٹھا اور پھر سے گھٹنوں پر آ گیا اور پیٹھ پر جوار کے بورے کی طرح لدے لاس گانو کے مہمان کو اُچھال پھینکنے کی جدوجہد کرنے لگا۔ اتنے میں مہمان نے ریت پر ٹکے ہوئے بنڈا کے ہاتھ پر کہنی کے پاس ضرب لگائی اور اس سے پہلے کہ بنڈا کچھ سمجھ سکے کہ کیا ہو رہا ہے، اُس کی پیٹھ زمین سے لگ چکی تھی۔ مہمان اُٹھا اور زور سے خم ٹھونکتا ہوا بولا "الحق! چت ہو گیا سالا!"

یہ سُنتے ہی بنڈا تلملا کر اُٹھا اور مہمان کے اُوپر جست لگاتا ہوا بولا "سالا کس کو کہتا ہے رے بھڑوے!"

مومن کے دونوں لڑکوں نے اُسے دبوچ لیا اور بولے "پٹیل، مارا ماری نہیں کرنے کی، جیت کی مستی میں میمان کے مُنہ سے غلط لفظ نکل گیا، اس کے لیے ہم آپ سے مافی مانگتے ہیں"

مگر بنڈا جال میں پھنسی مچھلی کی طرح اُچھل رہا تھا۔ یہ دیکھ کر مومن کے لڑکے نے مہمان کو ڈانٹتے ہوئے کہا "تم بھاگو یار گھر کو! دیکھتے کیا ہو؟ بہت ہو چکی اکڑفوں!"

یہ سُنتے ہی لنگی اور قمیص اُٹھا کر مہمان گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

بنڈا غصّے میں پاگل ہو رہا تھا۔ پرائے گانو کا ایک مہمان اُسے چت کر دے اور اوپر سے

گالی بھی دے۔ اُس کی زبان جڑ سے اُکھاڑ کر ہاتھوں میں دے دوں گا۔

مومن کے لڑکے جب ہاتھ پانو پڑنے لگے تو وہ ٹھنڈا ہوا۔ اُس نے اپنے کپڑے بغل میں دبائے اور گردن نیچی کیے باغوں کی طرف نکل گیا۔ لیمو کے سایے میں وہ یوں ہی بیٹھا رہا اور جب دماغ بالکل شانت ہو گیا تو باغوں میں بسی اپنی بستی کو لوٹ آیا۔

تب تک بابو کے کانوں تک یہ خبر پہنچ چکی تھی۔ مومنوں کے مہمان کے ہاتھوں اُس کے لڑکے کا دھول چاٹنا اُس کے لیے بڑی شرم کی بات تھی۔ رات کو جب وہ باغ کے کاموں سے تھکا ہارا، ادھ ننگا گھر لوٹا تو اُسے اپنا بیٹا شرمندگی سے سر جھکائے بیلوں کو چارا ڈالتا ہوا نظر آیا۔ بابو لڑکے کے پاس جا کر تن کر کھڑا ہو گیا اور کرخت لہجے میں بولا "کیوں بے لونڈے؟ باپ کی گردن نیچی کر دی نا۔ مومن سے ہار گیا۔ میرا کھوپرا چھوہارا اور دودھ بالکل ضایع کر دیا۔ تھو ہے ترے مُنہ پر!"

لڑکے کو بُرا بھلا کہہ کر کچھ کھائے پیے بنا ہی بابو گانو میں آگیا۔ ہاتھ کی لالٹین کو اندھیر میں جھلاتا ہوا آیا اور جا کر ماروتی کے مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ آنے جانے والوں نے اُسے اِس طرح بیٹھا ہوا دیکھا تو پوچھ بیٹھے "کیوں بیٹھے ہیں باباورا؟"

مگر بابو نے ٹھیک سے جواب ہی نہیں دیا۔ 'دیو' اور 'مہاراج' لگا کر بڑی خاکساری سے سب کو مخاطب کرنے والا اور ہاتھ جوڑ کر پورا نمسکار کرنے والا بابو آج چہرہ بے حس بنائے رہا اور کچھ نہ بولا۔ ننگے سینے کو مَلتے ہوئے بیٹھا رہا۔ لوگوں نے تاڑ لیا کہ وہ بُری طرح بگڑا ہوا ہے اور اس بات کی خبر مومنوں کو کر دی۔

"سنبھل کے رہو مومنو! بوڑھا بابو بہت بگڑا ہوا ہے۔ سالو تم لوگوں کی خیریت نہیں ہے اب۔"

بابو بڈھا بگڑا یعنی سارا گانو بگڑا۔ کیوں کہ اس کا کنبہ قبیلہ بہت بڑا تھا۔ بیس پچیس جوان اور گرم دماغ لڑکے ایک دل ہو کر اس کی پشت پر تھے۔ اُس کی آواز پر آواز دینے کو تیار تھے۔

گانو والوں کی لائی ہوئی خبر سُن کر لاس گانو کا مہمان گھمنڈ سے بولا "بگڑ گیا تو کیا ہوا؟

ہمارا گھر تو گانو میں سے نہیں نکلتا نا؟"

مہمان کے یہ گھمنڈی بول سُن کر بوڑھی دادی تھر تھر کانپنے لگی اور بڑے لڑکے پر غُصّہ اُتارتے ہوئے بولی۔" ارے جا تو اس کے پاو پکڑ! اب کیا ہوگا گے میری ماں؟ اب کیا ہوگا اے اللہ؟"

گانو میں برسہا برس سے رہنے والی اور راماین پر خود ہی کے کہے ہوئے گیت گاتے ہوئے مراٹھی عورتوں کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے گھیرا ڈال کر ناچنے والی اِس بڑھیا کو عاجزی اور خوف نے ایسا گھیرا کہ وہ رونے لگی۔ بار بار سینہ پیٹتی ہوئی اس دروازے سے اس دروازے تک پھیرے لگانے لگی۔ لڑکوں کو بھی حالات کی نزاکت کا احساس ہو گیا۔ بمبئی میں رہتے ہوئے وہ تھوڑے بہت جری ہو گئے تھے لیکن اُنھیں اس کا یقین تھا کہ مومنوں کے اکلوتے گھر والے اس گانو کے مراٹھے اگر بگڑ اُٹھے تو مرغیوں کی طرح اُن کی گردنیں مروڑ کے رکھ دیں گے۔ پھر بھی بڑا لڑکا بُڑھیا پر برس پڑا۔

"تو چُوپ بیٹھ گے! ہم دیکھیں گے کیا ہوتا ہے!"

اور بابو بوڑھے کو منانے کے لیے وہ مندر کی طرف روانہ ہو گیا۔ بڑھیا نے اسے بار بار جتایا "کچھ اُلٹا سیدھا مت بولنا میرے بابا۔ اُس کے پاو پکڑ۔ بول ہماری گلتی ہوئی۔ ہاں بابا! سمجھ میں آئی بات؟"

بڑھیا کے الفاظ دھیان میں رکھ کر حسن مومن کا بڑا لڑکا جلدی جلدی مندر کے سامنے گیا۔ وہاں اُس وقت اور کوئی نہ تھا۔ سیڑھیوں پر لالٹین رکھے ہوئے بابو مہتار چُپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔

مومن کا لڑکا آگے بڑھا اور ہونٹوں پر سے زبان پھیرتے ہوئے بولا "پٹیل، میں پیر پڑتا ہوں ..."

مگر اس کی بات اِس سے آگے بابو نے سُنی ہی نہیں۔ وہ جھٹکے کے ساتھ پیر کی بھاری چپل نکال کر اٹھا اور مومن کے لڑکے کو اُس نے کھیت میں نکلے کالے بچھو کی طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ چپل کے کیلے اور نعل اس کے منہ، ناک اور سر پر لگنے سے وہ کھلے ہوئے ڈھاک

کی طرح نظر آنے لگا، قصائی کے ہاتھوں کی مُرغی کی طرح چھٹپٹاتے ہوئے قیں قیں کرتے لگا تو بھی بابو نے اپنی مار پیٹ جاری ہی رکھی۔ آخر بڑی چالاکی سے چھٹکارا حاصل کر کے وہ لڑکا ہائے وائے کرتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ اس پر بابو نے "تھو ہے تم مومنوں پر" کہتے ہوئے بیچ سے تھوک دیا اور اُلٹے ہاتھ سے ہونٹوں کا تھوک صاف کرتے ہوئے چل دیا۔ گنّے کے کھیتوں کی سُنسان پگڈنڈی پر دُور تک جانے کے بعد اس کا جسم اندھیرے میں نظروں سے غایب ہو گیا مگر اُس کے ہاتھ کی لالٹین بھوت کی مشعل کی طرح اُدھر میں چلتی رہی۔

اُس دن مومن کے گھر میں کہرام مچ گیا۔ مومن کے چھوٹے لڑکے نے مہمان کو سخت بُرا بھلا کہا جس پر خفا ہو کر اس نے سسرال کا پانی تک نہ پیتے ہوئے پیدل ہی لاس گانو کی راہ لی۔ 'داماد' اس طرح غصّے میں چلا گیا ہے اب میری بچّی کی خیریت نہیں ہے، یہ سوچ کر بڑھیا لڑکوں پر ناراض ہوئی، بُری طرح برس پڑی۔

بابو مہتار کی مار سے لڑکوں نے ایسی دہشت کھائی ہے کہ کھیتی باڑی، گھر بار بیچ باچ کر وہ بمبئی چلے جانے کی تیاری کرنے لگے ہیں، لیکن گانو کا کتّا بھی اُن کی اسٹیٹ خریدنے پر آمادہ نہیں ہے۔

بابو کہتا ہے "کون خریدے گا اُن ہلکٹ لوگوں کی زمین؟ جانے دو ہائے وائے کرتے ہوئے گانو چھوڑ کر! وہ اسٹیٹ تو ہماری ہی ہے۔ مومنوں کی زات بُری۔ اُن کی نسل نہیں چاہیے ہمارے گانو میں!"

اور مومن کے لڑکے مُنہ تکتے پھر رہے ہیں ایک ایک کا!۔

مدھو منگیش کرنک

دھرم

مہار واڑی کے چار لڑکے چلچلاتی دھوپ میں تالاب کی طرف جارہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں پیتل کی گہری تھالی تھی اور دوسرا کپڑے کا ایک ٹکڑا لیے ہوئے تھا۔ اسی اثنا میں ایک پگڈنڈی سے ایک کتا نکل کر ان میں شامل ہوگیا اور وہ پانچوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ چلتے چلتے بھپکا کو کچھ یاد آگیا اور وہ بولا "گجا! مردود تیرے منہ میں خاک .... کھلی کہاں ہے؟"

"گجا فوراً رک گیا۔ لمبے لمبے ناخنوں سے لنگوٹی سے باہر نکلے ہوئے کولھے کھجاتا ہوا بولا "کھلی؟ وہ تو گھر ہی پہ رہ گئی ـــــ اب؟"

"اب تیرا باپ! دوڑ کے جا اور لے آ جلدی۔"

گجا انہیں قدموں واپس مڑا اور جان توڑ کے دوڑنے لگا۔ ساتھ میں چلنے والا کتا کچھ دیر کے لیے دُبدا میں پڑ گیا۔ "گجا کے ساتھ جائے یا باقی منڈلی کے ہمراہ؟" اس نے زبان باہر نکال کر سوچا۔ چار قدم واپسی کے راستے پر چلنے کے بعد مڑا اور بقیہ تین لڑکوں کے ہمراہ تالاب کی طرف چلنے لگا۔

تالاب پر پہنچکر وہ سب ایک درخت کے سائے میں پناہ لیتے ہوئے گجا کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن بھپکا کو خاموش بیٹھنا نہ آتا تھا۔ اس کی زبان مکھیاں اڑانے کے لیے چلنے والی بھینس کی دُم کی طرح کسی نہ کسی موضوع پر بولنے کے لیے چُلبلاتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی اس کے دماغ میں اچانک کسی خیال نے سر اُبھارا اور بے چین ہوکر اس

نے بابلیا سے پُوچھا۔

"بابلیا! یہ بودھ والے کہاں کے ہیں رے؟"

"ممبئی کے۔"

"سوتو ٹھیک — پر یہ اتنے دنوں کہاں رہے؟"

"ممبئی میں — وہاں سب کو بدھ بنانے کے بعد ہمارے وطن میں آئے ہیں۔ یہاں کے مہاروں اور چماروں کو بدھ بنانے کے لیے۔"

چند لمحات سکوت میں گذر گئے۔ بھیکا کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ اُس نے بابلیا سے پھر سوال کیا۔

"بدھ ہو جانے سے کیا پھایدہ ہے؟"

"کیا پھایدہ؟ مراٹھوں اور برہمنوں کی طرح پاک صاف ہو جاتے ہیں۔ مندر جا سکتے ہیں۔ پھر کوئی مہاروں سے نپھرت نہیں کرتا — دور نہیں بھاگتا۔"

بھیکا کو بات کرنے کے لیے میدان مل گیا تھا۔ اب اس موضوع پر وہ بہت کچھ پوچھ سکتا تھا۔ دل ہی دل میں سوالات ترتیب دیتے ہوئے اس نے انگوٹھا منہ میں رکھ لیا اور تیزی سے ناخن کترنے لگا۔ لکھیا نے سامنے بیٹھے ہوئے کُتّے کی کنپٹی سے چپکی چیچڑی کو تنکے سے چھیڑنے کا شغل اختیار کیا اور بابلیا نے اُس راستے پر نظریں جما دیں جہاں سے گجا آنے والا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں گجا ہانپتا ہوا ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں مونگ پھلی کی پرت دار کھلی کی پوٹلی سی تھی۔

"شو — بہت حیران ہونا پڑا۔" گجا لمبی لمبی سانسیں لیتا ہوا بولا۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

"کھلی کا بورا باہر کی "پڑوی" میں تھا۔ سب کی آنکھ بچا کر پینڈ (کھلی) چُراتے میں ناک میں دم آ گیا۔ پھر بھی اماں نے سٹکتے ہوئے دیکھ ہی لیا مجھے۔"

گجا کی لائی ہوئی کھلی دو اوک بھر تھی۔ بندھی ہوئی پوٹلی کے کھولتے ہی سوندھی سوندھی مہک پھیلنے لگی۔ گجا نے مٹھی بھر کھلی نکال کر چار چار ٹکڑے سبھوں کے ہاتھوں

میں تھما دیے کتا منہ اٹھا کر نتھنے پھلانے لگا۔ مہک سونگھنے لگا۔ پھر جوں ہی گجا نے کھلی کا ایک ٹکڑا اس کے آگے ڈالا، جھپٹ کر چٹ کر گیا۔

"بھڑوا پینڈ بھی کھاتا ہے۔ آہستہ کھا آہستہ۔"

"چلو اب۔ دیر مت کرو"

لکھیا نے ایک ہاتھ میں تھالی پکڑی اور بھپکا نے اس پر کپڑا باندھ دیا جس طرح پکوان کے تھال پر سرپوش ڈالا جاتا ہے، اسی طرح اس تھالی پر کپڑا ڈال کر بھپکا نے پینڈے میں مضبوط گرہ لگائی۔ پھر بیچوں بیچ کپڑے میں سوراخ بنا کر وہ بولا۔ "ہاں اب اس میں تھوڑی سی پینڈ ڈال۔"

گجا نے کھلی کے ٹکڑے اٹھا کر یوں ہی اس سوراخ کے اندر دھکیل دیے۔ یہ دیکھ کر بھپکا آپے سے باہر ہونے لگا۔ "ارے بے وکوف! ایسی سوکھی پینڈ مچھلیاں کھاتی ہیں کیا؟"

"نہ کھانے کو کیا ہوا؟"

"تیرا باپ! مردود! مچھلیاں کیا بڑے بڑے دانت رکھتی ہیں ایسی کی ایسی پینڈ کھانے کے لیے؟"

"گجا نے کوئی جواب دینے کے بجائے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پینڈ کے پرت نما ٹکڑے بھپکا کو تھما دیے۔ بھپکا نے ترنت انھیں منہ میں ڈال کر جبڑا چلانا شروع کر دیا۔ اپنی پوری قوت صرف کر کے وہ اس پینڈ کے ٹکڑوں کو ڈاڑھوں تلے کچل رہا تھا۔ اسے کھلی چباتے دیکھ کر دوسروں کے منہ میں پانی آ رہا تھا۔

جب منہ میں رکھی کھلی کی لگدی سی بن گئی تو بھپکا نے اسے ہاتھ پر اگل کر آہستہ سے تھالی میں سرکا دیا۔ "یہ پینڈ تو منہ سے نکالی ہی نہیں جاتی ہے نا؟ سالی روٹی سے زیادہ لذیذ لگتی ہے۔"

"چپ رہو اب۔ مچھلیاں ڈر کے بھاگ جائیں گی۔"

لیکن چپ بیٹھے رہنے کو کسی کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔

سامنے تالاب میں کنارے کے پاس اتھلے پانی میں ان گنت چھوٹی چھوٹی مچھلیاں

گھوم پھر رہی تھیں۔ ان کے رُ پہلے کلّے دھوپ میں اور بھی چمک رہے تھے۔

بھپکا نے آگے بڑھ کر ہاتھوں میں پکڑی ہوئی تھالی آہستہ سے پانی میں لے جاکر رکھ دی۔ پانی میں اس کے قدم پڑتے ہی مچھلیاں گھبرا کر بھاگیں۔ پھر کھلی کی مہک نتھنوں میں پہنچتے ہی سب تھالی پر پل پڑیں۔ بھپکا تیزی سے مڑا اور دیگر ساتھیوں کے ہمراہ کنارے بیٹھ کر بے صبر نگاہوں سے تھالی کا جایزہ لینے لگا۔ ٹخنوں بھر پانی میں ننھی ننھی مچھلیوں کا جمگھٹ ہوگیا۔ ایک ایک انگشت کی مچھلیوں نے اُتھلے پانی میں طوفان برپا کر دیا۔

"امسال تالاب میں مچھلی بہت ہوگئی ہے کیوں؟"

"بہت کہاں ہے ـــ ہر سال ایسی ہی ہے ـــ تھوڑی زیادہ ہوگی اور کیا۔"

"بابلیا ـــ مچھلیاں کپڑے کے اندر جائیں تب تک ہم کیکڑے پکڑیں گے ـــ چلو۔ کالی پیٹھ والے کیکڑے۔"

یہ خیال سب کے من کو بھاگیا۔ اس ہنگام میں کالی پیٹھ والے لذیذ کیکڑے جی بھر کے پکڑے جا سکتے تھے۔

"چلو ـــ چلو"

چاروں اٹھ کھڑے ہوئے اور تالاب کی مینڈ کے پرے بہنے والے نالے میں پڑے پتھروں کو الٹنے پلٹنے لگے۔ بائیں ہاتھ سے پتھر الٹ کر اسے دونوں ٹانگوں کے درمیان پکڑا جاتا اور دائیں ہاتھ سے بھاگتے ہوئے کیکڑے کو بڑی مہارت سے دھر لیا جاتا۔ پیر کے انگوٹھے سے اس کی پشت پر دباؤ ڈالا جائے تو وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا پھر اس کے ڈنک اور پیر توڑ لیے جاتے۔

"گجی مردود مجھے دُدھارو کیکڑی ملی ہے۔"

"دیکھیں ـــ دیکھیں۔"

سب بابلیا کو ملی ہوئی عجیب چیز دیکھنے کو دوڑ پڑے۔ دودھ بھری کیکڑی قسمت سے ہاتھ لگتی ہے۔ جنگل میں پانچ پنکھڑیوں والا "مینڈ کل" کا پھول اور پانی میں دودھ بھرا کیکڑا یہ دونوں چیزیں کبھی کبھار ہی ملتی ہیں۔ وہ کرَوندے کے پتوں

کے برابر، نرم ملائم جسم کی دودھ جیسی سفید گرلی (چھوٹا کیکڑا) ہتھیلی پر رکھ کر بابلیا سب کو بتا رہا تھا۔ کومل جسم کا وہ ڈرپوک کیکڑا پانی سے باہر نکالے جانے پر ڈر کے مارے ادھ موا ہو کر گھونگھے کی طرح اس کی ہتھیلی سے چمٹا ہوا تھا۔

"شاباش رے بہادر!" بھیکا کے منہ میں لبالب پانی بھر آیا۔

"چل اس کے چار ٹکڑے کر۔ دیکھیں کیسی لگتی ہے۔"

بابلیا نے انگشتِ شہادت اور انگوٹھے کے درمیان پکڑ کر اس زندہ کیکڑے کے چار ٹکڑے کر ڈالے۔ اس وقت اس کے جسم سے سفید رس کی پچکاریاں سی اُڑیں۔ بابلیا کی انگلیاں گویا دودھ میں نہا گئیں۔ چاروں نے وہ چار ٹکڑے اپنے اپنے منہ میں رکھ لیے۔

"سالی زبان کو لگتے ہی حلق تک تر ہو گیا۔"

"ہونہہ چلو منہ کا مزا تو بدلا۔"

دوبارہ وہ سب پتھر الٹنے میں مشغول ہو گئے۔ کالی پشت والے کیکڑے تلاش کرنے لگے۔ بابلیا انگلیاں چاٹتا ہوا دوسرے دودھ بھرے کیکڑے کی تلاش میں جٹ گیا۔ اتنے میں مینڈ پر سے چل کر برہمن واڑی کے چند لڑکے تالاب پر نہانے کے ارادے سے آ دھمکے۔ ناڈکرنیوں کا سریش سب سے آگے تھا۔ مہاروں کے لڑکوں کو کیکڑے پکڑتے ہوئے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ وہ بولا۔"ارے بابلیا! اب تم لوگوں کے لیے مچھلیاں اور کیکڑے کھانا جائز کیسے ہو سکتا ہے؟ تم بدھ ہو گئے ہو نا؟"

"بدھ کسے کہتے ہیں جانتے ہو تم لوگ؟" سُریش کے ایک ساتھی نے دریافت کیا۔

"مردُود! اب تم دوبارہ دھرم بھرشٹ ہو گئے۔ پھر سے مہار بن گئے۔ مچھلیاں مارنے کے بعد ـــــ" سُریش نے نتیجے سے باخبر کیا۔

مہاروں کے لڑکے اپنا شغل چھوڑ کر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ برہمن واڑی کے لڑکوں کو کیا جواب دیا جائے۔ آخر بھیکا بولا۔

ارے بابا وہ سب باتیں ہم سے مت پوچھو۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا ۔ جی چاہتا ہو تو تم بھی آکر ہمارے ساتھ کیکڑے پکڑو ۔ آؤ ہم مدد کرتے ہیں تم لوگوں کی ۔"

برہمنوں کے بچے اس سے قبل کہی ہوئی باتوں کو بھول کر نہر میں کود پڑے ۔ مہار اگر انہیں کیکڑے پکڑ کر دیں تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی تھی ؟ بڑے بڑے ڈنک رکھنے والے کیکڑے پکڑنے میں مہاروں کا مقابلہ کون کر سکتا تھا ؟

" بابلیا بڑے ڈنک والا کیکڑا پکڑ دے گا تو تجھے ایک آنا دوں گا۔" سریش نے جیب سے ایک سکہ نکالتے ہوئے کہا ۔

" آجا دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے ۔"

سب جنے مل کر پھر پتھر الٹنے پلٹنے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے ۔ بابلیا اور بھپکا سب سے آگے اور برہمنوں کے لڑکے ان کے پیچھے پیچھے ۔ سریش بابلیا کو ملنے والے کیکڑے کے اگلے دو ڈنک اسی سے تڑوا رہا تھا کہ اچانک کسی کی نظر سامنے گھاس کے میدان پر پڑی ۔

" کون آرہے ہیں رے اُدھر ؟"

سبھوں نے گردنیں اونچی کر کے اس طرف دیکھا ۔ اتنی دور سے کسی کو پہچاننا مشکل تھا ۔ تھوڑی ہی دیر میں آدمیوں کی ایک قطار تالاب کے کنارے گہری کھائی میں اتر پڑی اور سبھی آسانی سے پہچان لئے گئے ۔ سب سے آگے سوم ناتھ مہار تھا اور اس کے پیچھے مہار واڑی کے تمام مرد چل رہے تھے ۔ شبو ناک ، مو ہنیا ، بھاگیا ، بلیش ناک اور رو گیا وغیرہ ۔ دور ہی سے پہچان کر مہار لڑکوں میں گھبراہٹ پھیل گئی ۔ انہیں مہار واڑے میں رات کو بلائی گئی سبھا (میٹنگ) یاد آئی اور ساتھ ہی بمبئی سے آئے ہوئے مہمانوں کی تقریریں بھی ۔ منتر اور عہد یاد آئے اور رات کو جلسے میں کیا گیا فیصلہ ان کے ذہن میں گونجا ۔

سارے مہار لڑکے برہمن دوستوں کو وہیں چھوڑ کر جدھر سینگ سمائے بھاگنے لگے ۔ اچانک گجی کو سامنے " میڈھشی " کے درخت پر چڑھنے کا خیال آیا اور پھر

سبھی نے پلٹ پلٹ کر اس کی تقلید کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چاروں لڑکے اُس پاس کے درختوں کی گھنی شاخوں میں رُوپوش ہو گئے۔ مہاروں نے اپنے ساتھ لائی ہوئی دیوتاؤں کی مورتیاں پانی میں ڈبوئیں۔ بمبئی سے آئے ہوئے کارکنوں کے ذمّے یہ آخری فرض باقی رہ گیا تھا۔ مہار واڑی میں تبدیلِ مذہب کی رسم کل انجام پا چکی تھی - اب ہر گھر سے پرانی مورتیوں کے ہٹا دیے جانے پر دھرمانتر مکمل ہو جاتا - ہر مہار اپنے گھر سے مورتی کو کپڑے میں لپیٹ کر لایا تھا۔ کسی کے ہاں منتر پھنکوایا ہوا ناریل تھا تو کسی نے دتاتریہ کی تصویر کی پوجا کی تھی ــ اب یہ سارے دیوی دیوتا باہر نکل چکے تھے اور سب کے گھروں کے دیواستھان اور پوجا کے کمرے ان سے خالی ہو چکے تھے۔

لیش ناک نے اپنی مورتیاں پانی میں چھوڑ دیں اور واپس مڑنے لگا تو اس کی نظر اس تھالی پر پڑی جس میں مچھلیوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ اس کے قدم پانی میں تھم گئے۔ کنارے کھڑے مہاروں کی طرف دیکھے بغیر اس نے جھٹ سے نیچے جھکتے ہوئے تھالی پر ہاتھ ڈال دیا۔ کپڑے کے سوراخ سے مچھلیاں تھالی میں بھر چکی تھیں۔ یہاں تک کہ کسی کو باہر نکلنے کے لیے راستہ تک ملنا دشوار تھا، کپڑا پھڑپھڑانے لگا تھا اور زندہ مچھلیاں اندر تڑپ رہی تھیں۔ لیش ناک نے تھالی اٹھالی اور ہاتھوں پر تولتا ہوا بولا "یہ تھالی پہچانی سی لگتی ہے۔ ارے یہ تو ہمارے ہاں کی تھالی ہے ــ یہاں کیسے آئی ــ ایں؟" اس نے کنارے کھڑی منڈلی کی اور دیکھا۔ بمبئی کے مہمانوں کو چھوڑ کر اس کے سارے بھائی بند اسے خشمگیں نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ لیش ناک کچھ دیر کے لیے گڑبڑا سا گیا اور بے اختیار اس کی نظر بمبئی کے مہمانوں پر پڑی۔ بالفعل وہ ہوش میں آگیا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس سارے مہمان منہ ہی منہ میں بُدبُدا رہے تھے۔

"بُدھم سَرَنم گچھامی ــ"

لیش ناک نے خشک ہونٹوں پر گیلی زبان پھرائی ــ مچھلیوں سے لبالب بھری ہوئی تھالی پر بندھا کپڑا کھولا اور ساری مچھلیاں جوں کی توں پانی میں چھوڑ دیں۔

"مچھلیاں تھیں بھرپور ـــ خیر جانے دو ـ جیسی آپ لوگوں کی اِچھا۔" ہلکی آواز میں وہ بولا، اور دھوتی سے تھالی خشک کرتا ہوا کنارے پر آگیا۔ بمبئی کے مہمانوں کے منہ سے ایک مرتبہ پھر نکلا

"بُدّھم سَرنم گچھامی!"

اور ان کے پیچھے چلنے والے سارے لوگ اس کا وردسا کرنے لگے۔ پھر ان کا جلوس دوپہر کی تیز دھوپ میں گاؤں کی سمت روانہ ہوگیا۔

اتنی دیر تک درختوں کے پتوں میں چھپ کر بیٹھے ہوئے مہاروں کے لڑکے نیچے اُتر پڑے۔ وہ آپس میں زور زور سے باتیں کرنے لگے۔

"سالا ـــ یہ بُدھ والے اسی سَمے کیسے آگئے۔"

"اپنے نصیب اور کیا؟"

"گجی، کھلی کا ٹکڑا ہو تو دے ناخن برابر ـ بہت بھوک لگ رہی ہے ـ موت آئے ان مچھلیوں کو۔" بابلیا نے اکتا کر کہا۔ گجی کی کھلی کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے بہت غصّہ آرہا تھا۔ تھالی میں کھلبلی مچا دینے والی مچھلیوں کی یاد اس کے منہ میں پانی لا رہی تھی اور اس کا علاج اسے نہیں سوجھ رہا تھا۔ پھر اس نے پیروں کے پاس پڑا ہوا ایک پتھر اٹھایا اور تالاب کے پانی میں ٹانگیں پھیلا کر تیرنے والی مینڈکی کو نشانہ بنا کر اچھال دیا۔ پانی پر موجود سارے مینڈکوں نے ڈبکیاں لگائیں اور کنارے پر سستاتے ہوئے مینڈک بھی یکے بعد دیگرے پانی میں کود پڑے۔

"ہٹ تیری کی ـــ حرامجادے مینڈک ـــ دیکھو کیسے بھاگتے ہیں۔" بابلیا نے بڑبڑاتے ہوئے ایک اور پتھر پھینکا۔

پھر سرلیش سے بھی نہ رہا گیا۔ اس کی طبیعت بھی لہرائی۔ ہاتھ میں تھاما ہوا چھوٹا سا کیکڑا پتوں میں لپیٹ کر احتیاط سے جیب میں رکھا اور تیزی سے پتھر اکٹھا کیے۔ بھری دوپہر میں پھر پانی پر "روٹیاں" بنانے کا کھیل خوب جمنے لگا۔ =

شن۔ نا۔ نورے

اِس میلے میں

ماما کا ہاتھ تھامے رتنا میلا گھوم رہی تھی اور میلے والوں کی نظریں اس پر منڈلا رہی تھیں۔ حاملہ ناگن جیسی چمکدار اور چکنی جلد والی رتنا کا انگ انگ کھلا پڑ رہا تھا۔ اس کے جوان سینے سے چمٹی ہوئی پھولدار سرخ چولی اور رانوں سے لپٹی ہوئی ہری ساری نے اسے بلا کا پُرکشش بنا دیا تھا۔ اُبلتے ہوئے سینے پر گلے کے بٹن کے بعد کھلے رہنے والے چولی کے دونوں نچلے حصوں کو اس نے مضبوطی سے کس رکھا تھا۔ بٹن اور گرہ کے درمیان کی کھڑکی سے روشنیاں اُبلی پڑ رہی تھیں۔ ہری ساری سے باہر نکلی ہوئی گوری گوری ٹانگیں، چمکیلے گھٹنے اور بھرے بھرے پیر بڑے دلکش لگ رہے تھے۔

چکر کھاتے ہوئے ہنڈولے کی طرف گردن اٹھا کر دیکھنے والی رتنا اس پاس کی نظریں جھیل کر چولی کی کھڑکی سے اندر جھپٹ رہی تھی۔ جادو کے کرتب والے خیمے سے باہر کھڑے مسخرے کو دیکھ کر منہ پر ہات رکھ کے ہنسنے والی رتنا کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے والا دل ہی دل میں کہہ اٹھتا "اے کاش یہ اسی طرح ہنستی رہے اور ہنسی کے جھونکوں سے اس کا پلّو اُڑ جائے اور اس کے پیچھے چھپا ہوا نونوں کا جوڑا جھولتا ہی رہے۔"

ماما کا ہات تھامے رتنا گھوم رہی تھی۔ چائے خانے میں بیٹھ کر بھجیا کھا رہی تھی، حلوائی کی دکان سے شکر پارے لے رہی تھی، گھنٹیوں کی تال پر گھومنے والے رس کے کولھو پر جا کر گنے کا رس پی رہی تھی۔ "میلا ــــ میلے جیسا مزا کہاں ہے؟" ہر طرف بھیڑ تھی شور تھا، دھول تھی اور اُجالا بھی۔ رنگا رنگ بھیڑ بڑی دلچسپ لگ رہی تھی۔ گیس کے

ہنڈوں اور بجلی کے قمقموں کی روشنی میں ہر طرف اُڑنے والی دھول سونے کے دھوئیں جیسی لگ رہی تھی۔ بھیڑ، ہنگامہ اور دھول ـــ لیکن کسی کو اس کا احساس تک نہ تھا۔ سب کے چہرے بس ہنس رہے تھے، سب جوش وخروش سے بول رہے تھے، خوش خوش چل پھر رہے تھے۔

ماما کا ہاتھ تھامے چکراتی پھرنے والی رتنا من ہی من ہنس رہی تھی۔ میلا دکھانے کے لیے ماما اسے میکے لائے تھے۔ اور آج میلے میں لے آئے تھے میلے میں خرچ کرنے کے لیے اسے دو روپے کا نوٹ بھی دیا تھا انھوں نے۔ رتنا ننھی بچی بنی ہوئی میلے کے مزے لوٹ رہی تھی۔ ماما نے اچانک بڑے پیار سے پوچھا "رتنا ـــ یاد آ رہی ہے سسرال کی ؟ ـ گوپال کی ؟" رتنا شرما گئی۔ گھر کی یاد ـــ گوپال کی یاد ـــ اسے اس وقت گوپال ہی کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ سر پر زرتار صافہ اور بائیں ہات پر اس سے لگ کر چلنے والی رتنا سے مل کر بننے والی گوپال کی تصویر اسے چاہیے تھی۔ میلے میں آدمی ایسے ہی تو گھومتا پھرتا ہے، جسم سے جسم لگائے، بھیڑ میں بھی تنہائی کا لمحہ چراتے ہوئے۔

"جسم سے جسم لگائے ؟ ـــ بھیڑ میں تنہا ؟"

یہ بات تو وشرام نے کہی تھی اس سے۔ آج سے تقریباً دس سال پہلے۔ اسی میلے میں اُس وقت تو وہ کنبی کاشتکار کی ایک الھڑ اور بھولی لڑکی تھی۔ ان سب باتوں کا مطلب وہ نہیں سمجھتی تھی۔ اب دس سال بعد وہ وشرام کے بجائے ماما کا ہات تھامے بچی بنی گھوم رہی تھی۔ اب وشرام کہاں ہوگا ؟ اُس رات رتنا کے باپ نے مار مار کر اس کی کھال ادھیڑ ڈالی تھی۔ اور دوسرے دن وشرام گھر سے غایب ہو چکا تھا۔ چند روز اس کی یاد بے طرح ستاتی رہی اور پھر وہ اسے بھول گئی ـــ پھر اس کا بیاہ ہو گیا گوپال کے ساتھ اور وہ اپنے چھوٹے سے نئے سنسار میں کھو سی گئی ـــ آج دس سال بعد اسی میلے میں اسے وشرام کی یاد آ گئی۔ وشرام کہاں ہے، کیا کرتا ہے اس سے رتنا لاعلم تھی دس سال قبل وہ گوبر سے لیپی ہوئی دیوار پر گیرو اور چونے

سے تصویریں کھینچا کرتا اور کہا کرتا تھا کہ شہر جاکر تصویریں بنا بنا کر بہت سا پیسا کمائے گا۔

"وشرام ـــ وشرام"

اس کے باپ کی اوٹ پر چار گھروں کے باسی ٹکڑے کھا کھا کر پلنے والی ننھی سی جان کو بابا ہی نے رہنے کے لیے جگہ دی۔ پھر کام دیا اور آہستہ آہستہ بیٹا بنالیا..... وشرام بڑا ہنرلڑ کا نکلا۔ وہ ہر فن میں طاق تھا۔ کھیتوں پر محنت مزدوری کرنے والے ہات دیوار لیپتے ہوئے تصویریں کھینچتے ہوئے بڑے سبک و نازک بن جاتے ـــ باہر مردانگی جتانے والی بھاری بھرکم آواز رتنا سے بولتے وقت ہلکی اور شیریں ہوجاتی وہ لکھنا پڑھنا بھی سیکھ گیا تھا ـــ کہانیاں سنایا کرتا۔ دلچسپ شرارتیں کیا کرتا۔ رتنا کا باپ کہتا "میرے بیٹا نہیں تھا۔ بھگوان نے وشرام مجھے دے دیا۔"

جوں جوں رتنا بڑی ہوتی گئی اس کی بُوا اسے خبردار کرنے لگی "وشرام سے دور دور رہا کرو۔ وہ مرد ہے۔ تجھ سے بڑا ہے۔" لیکن اس کی سمجھ میں نہ تو یہ باتیں آتیں اور نہ ہی وہ ان پر یقین کرتی تھی۔ بوا کے منع کرنے پر اسے وشرام کے ساتھ رہنے میں اور مزا آتا بوا کس چیز سے ڈرتی ہے یہی بات وہ معلوم کرنا چاہتی تھی۔ لیکن جیسے جیسے رتنا کلی سے پھول بنتی گئی، وشرام بھی ہوش کھوتا چلا گیا۔ اب رتنا سے بات کرتے وقت نظریں ملانا اس کے بس میں نہ رہا۔ اس کے جسم سے ہات چھوجانے پر وشرام کے بدن میں چنگاریاں سی دوڑنے لگتیں اور یہ تبدیلی محسوس کرنے والی رتنا کو اس کے قریب جانے میں لطف آنے لگا۔ وہ جان بوجھ کر اس سے سٹ کر بیٹھتی اور گھنٹوں باتیں کرتی رہتی۔ ایک مرتبہ تو اوٹ کے اندھیرے میں اسے چڑانے کے لیے وہ اس سے لپٹ ہی پڑی تھی۔ اس وقت تک اس کے جسم کی تتیا میں نسیم شباب جو پھول کھلا چکی تھی ان سے وہ بے خبر تھی لیکن جب وشرام نے بھی اسے قریب کرلیا اور لمس کی تتلیوں کے ذریعہ ان پھولوں کی موجودگی کا احساس دلایا تو وہ چونک پڑی۔

اس کے بعد اسے وشرام کے پاس پاس رہنے میں لذّت کا احساس ہونے

لگا۔ اس کے لمس، اس کے الفاظ میں اسے جادو کا سا اثر معلوم ہونے لگا۔ اسے اس پر مسرت آمیز حیرت ہوتی تھی کہ اس کے اندر چھپا ہوا خزانہ وشرام تلاش کر دکھاتا تھا۔ رات کا کھانا کھانے ہی وشرام سے گپ شپ کرنے کے بہانے اوٹی پر جانا، پہلے زور زور سے باتیں کرنا اور باتیں کرتے کرتے ہاتھوں میں ہاتھ پھنسانا اور پھر لچسپ آنکھ مچولی ـــــ یہ روز کا معمول بن گیا تھا۔ کبھی کبھی وہ سبھوں کو سوتا دیکھ کر وشرام کے لحاف میں گھس جاتی اور اس سے لپٹ کر اپنے تپتے ہوئے دماغ کو ایک ٹھنڈک سی پہنچایا کرتی۔ لیکن پیاس بجھنے کے بجائے بڑھتی چلی گئی۔ دن میں جب بھی موقع ملتا وہ ایک دوسرے سے لپٹ جاتے۔ جسم کی گولائیوں پر وشرام کی انگلیاں سِتار کی طرح دوڑتیں اور اس کے جسم میں سرور کی کلیاں کھل جاتیں جن کی مہک اسے اتنا مست کر دیتی کہ اس کے اعضا ٹوٹنے لگتے۔ لیکن چوری چھپے کھیلی جانے والی یہ بازی اب تک نامکمل ہی رہی تھی۔ آخری چال چلنے کے لیے مکمل تنہائی کی ضرورت تھی۔

پھر دیوی کے میلے کا دن آگیا۔ وشرام کے ساتھ رتنا بھی ہولی۔ وشرام کو بیٹا سمجھنے والے رتنا کے باپ نے اسے اجازت دے دی۔ میلے میں وشرام کا ہاتھ تھامے رتنا گھومتی پھری۔ اس سے لپٹ کر وہ ہنڈولے پر سوار ہوئی۔ اس سے چمٹ کر اس نے جادو کے زور سے بولنے والے سر دیکھے اور گھر لوٹتے وقت انھیں کھیتوں میں تنہائی کی دیوی مل گئی کرنوں کے رتھ پر سوار۔ وہیں وشرام نے اس سے شادی کے لیے کہا۔ بولا "ہم دونوں بمبئی بھاگ چلیں گے۔ راجا اور رانی کی طرح ٹھاٹ سے رہیں گے۔" رتنا کو سب کچھ منظور تھا۔ بمبئی میں وہ ہر لمحہ اس نئی لذّت سے ہمکنار ہونے والی تھی۔ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھی لیکن وشرام اسے سکھا دے گا اور پھر وشرام کی سنائی ہوئی نٹ کھٹ کہانیاں خود بھی پڑھا کرے گی۔

پر نہ جانے کس نے رتنا کے باپ سے چغلی کھائی۔ چاندنی میں لوٹے ہوئے کلیوں کے ہار جسم پر سجائے ہوئے جب وہ دونوں گھر میں گھسے تو رتنا کا باپ گرجا "حرامزادے! تیرے ساتھ بچی کو روانہ کیا تو یہ دھندے۔" اور وشرام کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کے

گالوں پر مسلسل تھپڑوں اور گھونسوں کی بارش شروع ہو گئی پھر کونے میں کھڑی لاٹھی سے اس کے انجر پنجر ڈھیلے کر دیے گئے ڈری ہوئی رتنا دروازے میں کھڑی وشرام کو پٹتا ہوا دیکھتی رہی۔ اُسے اپنا سارا جسم اینٹھتا ہوا سا معلوم ہونے لگا۔ وہ چکرا کر گرنے ہی کو تھی کہ اس کی بوا اسے سنبھال کر اندر لے گئی۔ کڑوا کسیلا عرق اس نے رتنا کو پلایا جس کے اثر سے رتنا رات بھر بغیر درد کے کراہتی رہی۔ پھر دو چار دن تک وہ بستر ہی سے لگی رہی۔ جب طبیعت سنبھلی تو پتا چلا کہ وشرام غایب ہو چکا تھا۔

سال بھر کے اندر رتنا کا بیاہ ہو گیا۔ سسرال دور تھی لیکن محبت کرنے والے خوش حال لوگ تھے۔ ایکڑوں زمین، بیسیوں مویشی، بڑا سا کھپریل کی چھت والا مکان اور دلدار گوپال۔ آہستہ آہستہ رتنا پچھلی تمام باتیں بھول گئی۔ گوپال نے وشرام کے لمس کو مٹا کر اپنے لمس کا سِکّہ بٹھا دیا۔ وہ بھی پڑھا لکھا تھا۔ اس کی بات چیت اور اس کا سلوک دل کو موہ لیتا۔ بس صرف ایک بات کی کمی تھی۔ رتنا کے ہاں کچی پیدائش ہوتی اور بچہ ضایع ہو جاتا۔ بوا کا پلایا ہوا عرق پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔

لیکن اس مرتبہ تعلقے کی ڈاکٹرنی نے حتی الامکان کوشش کر کے سب ٹھیک ٹھاک کر دیا تھا۔ دیوی کے اُشیرواد سے لڑکا ہونے والا تھا اور وہ سکھ ساگر میں ڈوب جانے والی تھی، دیوی سے اس نے منت مانی تھی چنانچہ میلے کے لیے ماما کا بلاوا آنے پر گوپال نے اسے فوراً روانہ کر دیا تھا ـــــــ اور اس وقت ماما کا ہات تھامے ہوئے رتنا میلے میں گھومتے ہوئے کچھ دیر کے لیے سپنوں کی دنیا میں کھو گئی تھی۔ بچے کا خیال آتے ہی جسم سے لپٹی ہوئی چولی رتنا کو اور بھی تنگ محسوس ہونے لگی۔ سینے میں اینٹھن سی ہونے لگی، میلے کا شور شرابہ دماغ میں بگولے اٹھانے لگا اڑتی ہوئی سنہری دھول میں سوندھی سوندھی مہک کا احساس ہونے لگا اور جسم تھرتھرا اٹھا۔

پھر اسے چونک کر ہوش میں آنا پڑا۔ مندر کے گھنٹے زور زور سے بج رہے تھے آرتی کا وقت ہو گیا تھا۔ نقارے بجنے لگے۔ مشعلیں جل اٹھیں۔ پجاریوں کی دوڑ بھاگ شروع ہو گئی تھی۔ اب پالکی اٹھنے سے پہلے دیوی کے درشن نہیں ہو سکتے تھے۔ جو

لوگ مندر سے باہر تھے وہ خریداری میں لگ گئے۔ دوکانوں پر بھیڑ بڑھ گئی۔ ہنڈولوں کے پاس قطاریں لگ گئیں۔ شور کی لے تیز ہو گئی۔ بھیڑ کا بھنور تیزی سے گردش کرنے لگا۔ رنگ تیزی سے اپنی جگہیں تبدیل کرنے لگے۔ تمام خیمے اور دکانیں انسانوں سے بھر گئیں۔ رتنا ماما کے ہمراہ فوٹو گرافر کے خیمے کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ فوٹو گرافر نے سر پر جمائی ہوئی فرکیپ کو نرچھا کیا اور آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"پھوٹو چے کورے پیشے؟" رتنا نے پوچھا۔

"آپ کے لیے ایک دم سستا ـــــ اندر آجاؤ۔"

"کورے پیشے؟"

"دو روپیا ـــــ تین فوٹو۔"

"دون روپے!! نکو۔"

"فوٹو گرافر بد ذوق نہ تھا اس نے دام کم کر دیے" ایک روپے کے دو۔ آجاؤ!"

"نکو ـــــ چار آنے؟"

"نہیں جی مفت میں کھنچوالو۔ آجاتے ہیں......"

رتنا آگے بڑھ گئی۔ فوٹو والے کی دکان سے لگی ہوئی چوڑیوں والے کی دکان تھی مٹی کے تیل کے چراغ کی روشنی میں رنگ برنگی چوڑیاں چمک رہی تھیں۔

"چوڑیاں پہنو گی؟"

"اوں ہوں۔ ابھی تو پہنی ہیں۔" ہاتھوں میں پڑی ہوئی چوڑیاں گھماتے ہوئے رتنا نے جواب دیا۔ اس کے گورے ہاتھوں میں ماما کی پہنائی ہوئی ہری چوڑیاں بہت سج رہی تھیں۔

"ماما" اچانک یاد آنے پر اس نے آواز دی۔ جواب نہ آنے پر وہ چونک کر مڑی۔ ماما کا پتا نہ تھا وہ اب تک فوٹو گرافر کی دکان کے پاس کھڑا تصویریں دیکھ رہا تھا تماشا اور ناٹک میں کام کرنے والیوں کی۔ "رتنا" اس نے پکارا اور وہ اسے پا کر چھوٹی بچی کی طرح مسرور ہو اٹھی۔ "رتنا میں اس دکان پر ہوں تو گھوم پھر کر آجا ہیں،

دور مت نکل جانا۔" رتنا سر ہلا کر آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی دور گُدنا گدانے والا بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے کاغذ پر تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ تلسی، برندابن، سری کرشن، گلاب، مارونی، تیرنے والی لڑکی ـــــ گدنا گدانے والی عورتوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ ایک عورت بیٹھی گردن موڑ کر ساری تکلیف سہہ رہی تھی۔ اس کی سکھیاں آس پاس کھڑی مزے سے ہنس رہی تھیں۔ دیے کی روشنی میں گدنا کرنے والی لمبی سی سوئی چمک رہی تھی اور ٹرر کی آواز کے ساتھ تصویر کھینچ رہی تھی۔

گدنا ختم ہوتے ہی اس عورت نے پیسے دیے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ کلائی پر خون کی بوندیں چھلک آئی تھیں ان پر سہیلیاں پھونکیں مارنے لگیں، تصویر کی تعریف کرنے لگیں۔ رتنا یہ دیکھ کر آگے بڑھی۔

"بائی گدنا کرالو۔ گورے ہاتھ پر تصویر بھلی معلوم ہوگی۔ تلسی کی چھاپ اچھی رہے گی چار آنے ہوں گے بالکل تکلیف نہیں ہوگی بیٹھ جاؤ نا۔"

رتنا اس کی باتوں کے دام میں آگئی۔ روپ کی تعریف نے دانے کا کام کیا تھا۔ وہ زمین پر اکڑوں بیٹھ گئی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر وہ گیلی روئی سے اس کی کلائی پونچھنے لگا۔ جب اس نے رتنا کی کلائی کو چھوا تو اسے ایسے لگا جیسے وہ اس لمس سے واقف ہے اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی وہ بول پڑا "تو رتنا ہے نا؟"

"ہاں ـــ اور تو وشرام؟"

"ہاں .... شوہر کے ساتھ آئی ہے کہ...."

"ماما کے ساتھ آئی ہوں۔ تو کہاں سے آیا ہے؟"

"میں بمبئی میں رہتا ہوں۔ میلے کے موقع پر یہاں آتا ہوں۔ چار پیسے مل جاتے ہیں۔"

"اچھا ہے نا تو ـــ تیرا دھندا ٹھیک چل رہا ہے نا؟"

"ہاں ـــ تو اپنی سنا۔"

"اچھی ہوں۔"

"شوہر کیسا ہے؟"

رتنا شرم سے چپ رہی۔

"بال بچے۔"

"اوں ہوں ـــــ تیری شادی؟"

"ہو گئی ـــ ایک بچی ہے۔ تیرے باپ نے مجھے مارا لیکن عمر بھر کے لیے راستہ مل گیا۔ بمبئی بھاگ گیا۔ وہاں چترکار بن گیا۔ کیسا ہے تیرا باپ؟"

"ٹھیک ہے۔"

"اور بوا؟"

"وہ بھی اچھی ہے۔"

"رتنا میں تیری بولی تک بھول چکا ہوں لیکن تجھے اب تک نہیں بھولا ـــ تجھ سے شادی ہو جاتی......"

رتنا نے جلدی سے ہتھیلی کو جنبش دی اور بات بدل دی "دس برس بیت گئے۔"

"ہاں دن کیسے تیزی سے گزر جاتے ہیں۔"

"مجھے جلدی لوٹنا ہے۔ تلسی کی چھاپ ڈال دے۔" رتنا نے کاغذ پر بنے تلسی کے پودے کی طرف انگلی دکھائی۔

"رتنا تصویر گدوانی ہے تو ہات کو رہنے دے ـــ اپنی ...." لیکن اس سے پہلے کہ دشرام کی نظر چولی کی کھڑکی سے اندر جائے رتنا نے اس کی راہ کھوٹی کی۔ "جلدی سے ہاتھ پر چھاپ ڈال دے"

"نام بھی لکھوانا ہے؟"

"ہاں۔"

"کس کا؟ شوہر کا؟"

"ہوں۔"

"تو کم از کم وہ تو سینے پر گدوا لے۔"

رتنا کی سمجھ میں پوری بات نہیں آئی لیکن گدوانے کی جگہ اسے معلوم ہو گئی۔

"بے شرمی مت کر ۔ ماما ادھر موجود ہیں ۔ مجھے جلدی جانا ہے ۔"

"نام کیا ہے شوہر کا ۔"

"........۔"

"شرماتی کیا ہے نام بتا نا ۔"

"تلسی کے پتی کا نام ڈال دے"

"کرشن ۔"

"اوں ہوں"

"کِسن کِسن"

"ناں"

"تب ۔ تو ہی بول ۔"

"نہیں تو ہی بتا ۔"

"اچھا گوپال ؟"

"ہاں ۔۔۔ وہی ۔"

وشرام نے گورے ہاتھ پر اپنی ہتھیلی پھیری ۔ پرانے لمس کی ایک بھی لکیر باقی نہ تھی روشنی کا رنگ پی کر جلد اور چمکیلی ہو گئی تھی ۔ اس کا رنگ روپ پہلے سے زیادہ دلکش لگ رہا تھا ۔ جسم میں پہلے سے زیادہ شراب بھری ہوئی تھی ۔ تلسی برندابن گودنے والا اس کا ہاتھ تھر تھرانے لگا ۔ رتنا کے جسم پر پڑنے والی اس کی ہر نظر دہشت زدہ سی ہونے لگی ۔ جلد ہی اس سلسلے کو ختم کرنا چاہیے ورنہ اس کے اندر دہکتی ہوئی آگ اس بھرے میلے میں نہ جانے کیا آفت لائے ۔"

گندنا ختم ہوتے ہی رتنا نے انٹی سے چار آنے باہر نکالے ۔ ماتھے کا پسینا پونچھتے ہوئے وشرام بولا "رتنا ۔۔۔ مجھے نہیں چاہئیں ۔۔۔ پرانی یادیں تازہ ہو گئیں اتنا ہی کافی ہے ۔ میری نشانی کے طور پر یہ گندنا لے لو تو ۔"

"نکو ۔" رتنا اس کے الفاظ کا مطلب نہیں سمجھ رہی تھی ۔ لیکن وہ اس کی یاد کو

بھی اپنے سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے سکّہ اس کے آگے اچھال دیا اور ہاتھ پر پھونکیں مارتی ہوئی فوٹو والے کے خیمے پر آ رکی۔ ماما اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔

"ماما چلو۔"

کیوں رتنا گدنا کرایا ہے۔"

ہات پر پھونک مارتے ہوئے رتنا نے سر ہلا دیا۔

"کون سا چھاپ لیا ہے؟"

"تلسی کا ۔۔ اور نام تو ۔"

"نام کس کا ۔۔ گوپال کا۔"

"ہاں ۔ یہ پڑھو۔" رتنا ماما کے چہرے کے پاس اپنا ہاتھ لے گئی۔

"ارے !"

"کیا ہوا؟"

"کس نے لکھا ہے یہ نام؟"

"کیوں؟"

"دھوکے بازی کی ہے۔ چھاپ میں نام ہے وشرام۔ گوپال نہیں ہے۔"

"ہے بھگوان ۔۔ اس نے اپنا ہی نام لکھ دیا نا رے ۔" دہل کر رتنا وحشت زدہ ہرنی کی طرح بھیڑ کو چیرتی ہوئی بھاگ نکلی۔

اور بھاگتے ہی اس منزل پر پہنچ گئی جہاں پہنچنے میں ابھی کافی دیر تھی۔

گنگا دھر گاڈگل

کچھ تلخ کچھ شیریں

ہمارے کمرے کے بڑے آئینے میں دیکھتے ہوئے میں گردن لچکا رہی تھی۔ کل دیکھے ہوئے سینما کی ناچنے والی بائی کی طرح۔ اتنے میں دروازے کی اور سے آواز آئی:

"واہ! بہت خوب۔"

ایک دم دہل گئی میں۔ شریمان جی صبح کی چہل قدمی ختم کر کے واپس آ چکے تھے۔ ان کے تو سارے کام بس گھڑی کی سوئیوں کی طرح ہوا کرتے ہیں۔ قدموں کی ہلکی سی آہٹ تک نہیں ہوتی۔

میں کونے میں رکھی ہوئی میز کے پاس جا کر ڈانٹ پھٹکار کے انتظار میں چپ چاپ سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

"دیکھ رہا ہوں کہ بہت تیز ہوتی جا رہی ہو تم۔"

میں نے ہنسی کو دبایا۔ وہ غصہ کرنے لگتے ہیں تو مجھے ہنسی آنے لگتی ہے۔ یہ مرد سمجھتے ہیں عورتیں ان کے غصے سے ڈر ہی تو جاتی ہیں۔

"تمہیں اداکاری کرنی ہے، گھر کا کام کاج نہیں کرنا، گھر میں جھگڑا کرنا اچھا لگتا ہے، چنچل کھانا پسند ہے کیوں؟"

میں کاغذ پر کوا بنا رہی تھی۔

"کاغذ مت خراب کرو"

میں نے پنسل رکھ دی۔

"میں تم سے بات کر رہا ہوں"

میں نے دوبارہ پلو منہ سے لگا لیا اور چپ چاپ کمرے سے باہر نکلنے لگی لیکن میری دبائی ہوئی ہنسی ان کی تیز نظروں سے چھپ نہ سکی۔

"اور خوامخواہ ہنسنے کی بے ہودہ عادت پڑ چکی ہے تمھیں" وہ گرجے

اور مجھے سر پر ایک چپت کا پرشاد مل گیا۔ ان کی چپت غصہ ختم ہو جانے کی نشانی ہوتی ہے۔

نیچے آتے ہی سات بجنے کی ٹن ٹن کانوں میں پڑی۔ شریمان جی کے نہانے کا سمے ہو چکا تھا۔ میں پانی اتارنے کو لپکی ورنہ پھر سے ......

لیکن سماوار کے پاس پہنچی تو کیا دیکھتی ہوں کہ سماوار ٹھنڈا برف۔ اونہہ! جیٹھانی جی کے سارے کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ایک کام بھی ڈھنگ کا نہیں ہوتا۔ مجھے غصہ آگیا۔

"یہ کیا؟ سماوار میں آج کوئلے ہی نہیں ڈالے گئے"

اس طرح کوئی زور سے بولے تو ماتا جی ضرور سن لیتی ہیں۔ ہماری ساس کے کان بہت تیز ہیں اور زبان تو کانوں سے بھی تیز۔ پوجا گھر سے ان کی آواز گونجی۔

"کیا؟ گھر کا کام کاج چھوڑ کے سویرے ہی سویرے کہاں نکل گئی وہ۔ موئی سدا کی کام چور ہے"

ان کا چرخہ شروع ہوتے ہی مجھے خود ہی شرمندگی سی ہونے لگی۔ مجھے ہی جیٹھانی جی سے کہنا چاہیے تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کیا کر رہی ہیں، میں جو اندر گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ وہ دیوان خانے میں زمین پر لیٹی ہوئی ہیں اور ان کا دم چڑھا ہوا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی بڑی مشکل سے اُٹھ بیٹھیں اور بولیں۔

"بہت سانس پھول رہا ہے میرا۔ ذرا قابو میں آجائے تو سماوار جلاتی ہوں"

مجھے بہت بُرا لگا۔ میں نے کہا "ہائے رام اتنا دم چڑھا ہوا ہے آپ کا، آپ بھلا کام کیسے کریں گی؟ میں بستر لگائے دیتی ہوں، آپ آرام کیجیے۔ سماوار میں خود جلا لوں گی"

لیکن ہماری بات چیت پوجا گھر تک پہنچ ہی گئی۔ اماں وہیں سے بولیں "کون بول رہا ہے اُدھر دیوان خانے میں۔ اَن پورنا ہی ہے نا وہاں؟"

جیٹھانی جی اٹھنے کے لیے پھر سے چھٹپٹانے لگیں۔ میں نے اشارہ کیا کہ لیٹی رہیں اور بول اٹھی

"ان کا سانس پھول رہا ہے۔ میں جلا لیتی ہوں سماوار"

یہ سنتے ہی پوجا گھر میں زلزلہ آگیا۔

"کیا؟ مزے سے لیٹی ہوئی ہے کیا وہ مہارانی؟ حد ہوگئی بُوا اس عورت کی۔ بارہ مہینے اور اٹھارہ کال ایک سال اس کی بیماری لگی رہتی ہے۔ دن بھر میں چار تنکے اِدھر سے اُدھر کرتے نہیں بنتا۔

شادی ہوتے ہی پتی کو کھا گئی اور اب مجھے پہنچانے پر تلی ہوئی ہے۔"

جیٹھانی کو ایک دم رونا آگیا۔ وہ منہ ہی منہ میں بولیں "سچ مچ میں ہی بھنڈ پیری ہوں، کم نصیب ہوں، پہلے اپنے شوہر کی جان لے لی اور اب اُحدیوں کی طرح پڑی مفت کی روٹیاں توڑ رہی ہوں۔" اور انھوں نے تڑا تڑ اپنے گالوں پر تھپڑ برسانے شروع کر دیے۔

میں نے جھٹ ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کروں۔ اچانک میرا دل بھر آیا۔ اور میں نے ان کے بدن پر سے ہاتھ پھیرا۔ وہاں اور بیٹھتی تو رونا ہی آجاتا۔ اس لیے میں نے ان سے کہا "ٹھہریے میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔ اس سے طبیعت سنبھل جائے گی۔"

وہ بولیں "نہیں نہیں۔ اب طبیعت کو سنبھال کر کیا کروں گی۔ مرجانے دو مجھے تو بہتر ہوگا۔"

اب اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے؟ میں نے خاموشی سے اسٹو باہر لاکر جلایا۔ اماں کی آواز آئی "کون کھڑ بڑ کر رہا ہے اُدھر؟ نارائن آگیا ہے کیا؟ بیٹا نارائن ذرا پوجا گھر میں آکر جائیو۔"

نارائن ہمارے منجھلے دیور ہیں۔ ایک دم سیدھے سادے۔ بے وقوف ہی کہیے نا! لیکن اماں ان پر بہت جان دیتی ہیں۔ جب تب پوجا گھر میں بلا کر کچھ نہ کچھ کھانے کو دیتی رہتی ہیں۔ البتہ ہمارے صاحب پر سب جلتے ہیں۔ پوچھیے بھلا کیوں؟ سب سے زیادہ پیسے جو کماتے ہیں۔

اماں کو سنائی نہ دے اس لیے اسٹو کو زیادہ پمپ نہیں کیا۔ اتنے میں منجھلی دیورانی لپک جھپک وہاں پہنچ گئیں۔ انھیں لگتا ہے وہ بہت حسین ہیں۔ اس لیے ہر وقت بننا سنورنا اور کچھ کام نہ کرتے ہوئے دوسروں پر رُعب جمانا اُن کا فرض ہے۔ انھیں مرچیں لگتی ہیں اس بات سے کہ لوگ مجھے خوبصورت بتاتے ہیں اور میرے پتی کی تنخواہ بھی زیادہ ہے۔ اسی لیے وہ ہمیشہ میری چغلی کھاتی رہتی ہیں۔

کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے انھوں نے میری طرف دیکھا اور جان بوجھ کر اونچی آواز میں بولیں۔ "اب کیا اوپر کے کمرے میں چائے چاہیے؟"

پوجا گھر سے آواز آئی "کون بنا رہا ہے چائے؟"

میں نے منجھلی دیورانی کو غصے سے دیکھا وہ فوراً ٹھسا دکھاتی ہوئی بولیں "میری طرف دیکھ کر آنکھیں کیوں نکال رہی ہو؟ گھر میں تین تین بار چائے بنتی ہے اور شکر ختم ہو جائے تو اماں مجھ پر ناراض ہوتی ہیں۔"

جیٹھانی جی نے گھگھیاتے ہوئے کہا "سچ مچ مجھے چائے نہیں چاہیے۔ رہنے دو تم ورنہ تمھیں مفت

میں باتیں سننا پڑیں گی۔ مجھ مردار کا کیا ہے؟ مر جاؤں تو سب کو راحت ملے"

اتنے میں اماں پوجا گھر سے باہر آگئیں اور مجھ سے بولیں" سوشیلا۔ دیکھ رہی ہوں کہ تم بھی دن بدن بہت بے ہودہ ہوتی جا رہی ہو۔ تم سے کس نے کہا ہے کہ ہر کام میں دخل دیا کرو۔"

اور پھر وہ مجھے بے تحاشا باتیں سنانے لگیں۔ لیکن میں نے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا بیٹھی بلّی کے بچے کو دیکھتی رہی۔ جیٹھانی جی البتہ مارے لاج کے مری جا رہی تھیں۔

اتنے میں زینہ کھڑکا۔ وہ نہانے کے لیے نیچے اتر رہے تھے۔ اچانک ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ نہانے کیلیے گرم پانی نہ ملنے پر وہ کوئی ہنگامہ نہ کریں اس لیے میں نے انھیں آنکھوں سے اشارہ کرنے کی بہت کوشش کی (اماں کو بہوؤں کا شوہروں سے زیادہ بات چیت کرنا پسند نہیں) لیکن حضور تو اپنی ہی دُھن میں مگن تھے۔ کوئی موٹی سی کتاب دماغ میں چکرا رہی ہو گی اور کیا؟۔

نتیجہ یہ ہوا کہ نہانی سے غصّہ میں لال پیلے ہوتے ہوئے باہر نکلے اور لگے چلّانے" یہ کیا، آج نہانے کیلیے گرم پانی نہیں ہے؟ کرتی کیا ہو تم عورتیں گھر میں بیٹھے بیٹھے؟"

میں نے انگلی ہونٹوں کے قریب لے جا کر انھیں چپ ہو جانے کا اشارہ کیا تو زور سے پوچھنے لگے "اُں؟" مرد بھی ایسے ہوتے ہیں۔ آخر مجھے کہنا ہی پڑا" آج ٹھنڈے پانی ہی سے نہا لیں آپ۔"

وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر بولے" کیوں؟"

میں نے غصّے سے کہا" میں جو کہہ رہی ہوں"

اس پر جناب خاموش ہی ہو گئے۔

لیکن منجھلی دیورانی بھلا یہ موقع ہاتھ سے کیسے جانے دیتیں؟ رسوئی گھر سے نکل کر بیچ ہی میں ناک گھُسیڑ دی" کیا؟ جیجاجی کو ٹھنڈے پانی ہی سے نہانے کیلیے کہہ رہی ہو تم؟ اور جو انھیں سردی لگ جائے تو؟ گرم پانی دینا ایسا کون سا مشکل کام ہے۔ ٹھہر جاؤ میں ہی دیے دیتی ہوں انھیں پانی گرم کر کے" اور جان بوجھ کر وہ ان کے بالکل قریب سے ہو کر اندر چلی گئیں۔

مجھے ایک دم طیش آگیا۔ منجھلی دیورانی کو اس طرح اگوائی کرنے کی بُری عادت ہے۔ مردوں کے آگے پیچھے پھریں گی، بابایاں پیر نچائیں گی، لاڈ سے باتیں کریں گی اور دوسروں کی بُرائی کریں گی، ہمیں نہیں آتا بابا اس طرح دوسروں کے مَردوں کے آگے ناچتے پھرنا۔

میں نے چائے کی پتیلی اتار دی اور جیٹھانی جی سے کہا " آپ خود ہی لے لیجیے گا اب چائے چھان کر۔"

پھر جھٹ سے پانی کا بڑا پتیلا اسٹو پر رکھا۔ کچھ کچھ اسے پمپ کیا اور پانی ابلتے ہی لے جاکر ان کی بالٹی میں بھق سے انڈیل دیا۔ تھوڑا سا پانی ان پر بھی اڑ کر گرا۔" ارے ارے۔ پاگل تو نہیں نا ہو گئیں تم؟"

" جی ہاں، ٹھنڈا پانی کتنا ملاؤں، بتائیے۔"

وہ بولے " ہاں، بس بس۔ اجی ہو کیا گیا ہے تمہیں کہ اس طرح تاؤ کھا رہی ہو؟ تمہیں نہیں گرم کرنا تھا پانی تو بھابی کر دیتیں۔"

میں نے چڑ کر کہا " نہیں چاہیے میرا گرم کیا ہوا پانی تو لائیے پھینک دیتی ہوں میں۔"

" کیا مطلب؟"

" نہیں سمجھیں گے آپ، ایسی باتیں کتابوں میں نہیں لکھی ہوتیں۔" اور میں گھر کے اندر آگئی مرد بھی کتنے بھولے ہوتے ہیں۔

دیوان خانے میں جیٹھانی جی چائے کے ہلکے ہلکے گھونٹ لے رہی تھیں۔ اتنے میں ان کا لڑکا کرشنا وہاں پہنچ گیا۔ ماں کو چائے پیتا دیکھ کر چلانے لگا۔" یہ کیا؟ تم اکیلے ہی چائے پی رہی ہو اور ہم مانگیں تو ڈانٹنے لگتی ہو، مجھے بھی دو چائے۔"

جیٹھانی جی ہلکی آواز میں بولیں" کرشنا بیٹے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے تمہاری چھوٹی چاچی نے مجھے چائے بنا کر دی ہے۔ تم سمجھ دار ہو باہر جاکر پڑھنے بیٹھو۔"

کرشنا ہاتھ پیر پٹکتا ہوا بولا " تم تو مجھے کچھ بھی نہیں دیتی ہو۔ بابا تو مجھے گودی میں لے کر مٹھائی دیتے تھے، گھومنے بھی لے جاتے تھے۔ تم تو بس پڑھنے بٹھاتی ہو، کام کراتی ہو۔ ٹھہر جاؤ میں ابھی اندر جاکر سارے لڈو کھا لیتا ہوں۔"

جیٹھانی جی کی آنکھوں سے دوبارہ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور منہ تک لائی ہوئی چائے کی طشتری انھوں نے نیچے رکھ دی۔ میرے لاکھ اصرار کرنے پر بھی وہ چائے ان سے نہیں پی گئی۔ ادھر کرشنا رسوئی میں جاکر کھڑ بڑ کرنے لگا اور اماں نے چلانا شروع کر دیا۔ جیٹھانی جی پھولتی ہوئی سانسوں کے باوجود ادھر بھاگیں اور ہاتھ لگے بلونے سے انھوں نے کرشنا کو اس طرح پیٹنا شروع کر دیا گویا جان نکال کر دم لیں گی۔

میں نے جھٹ آگے بڑھ کر کرشنا کو ان سے چھڑایا اور باہر لے گئی۔ وہ ہچکیاں لیتا ہوا بولا" ماں

بہت بُری ہے۔"

میں نے کہا "نہیں بابا، ہم ہی لوگ بُرے ہیں۔" اور اسے دو میٹھی گولیاں دیں۔ وہ فوراً ہنسنے لگا۔ میری آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ اسے ہنستا دیکھ کر میرے دل میں اُتھل پُتھل ہونے لگی۔ میں نے گردن موڑی اور رسوئی گھر میں چلی گئی۔ اتنے میں پوجا گھر بول اُٹھا "چھوٹی بہو، رگھو، جاگ گیا؟"

رگھو ہمارے چھوٹے دیور ہیں۔ ایسے دُبلے پتلے جیسے ایندھن کی لکڑی۔ موٹے شیشوں کی عینک لگاتے ہیں۔ امتحان میں فیل ہوتے رہتے ہیں اور اپنے لمبوترے چہرے کو اور بھی لٹکا کے بیٹھ جاتے ہیں۔ اس طرح بیٹھے رہنا انھیں کیسے اچھا لگتا ہے یہ بھگوان جانے!"

اماں نے پھر وہی سوال دُہرایا۔ میں نے جواب دیا "اب تک آٹھ نہیں بجے ہیں۔ ان کے اُٹھنے کا سمے کہاں ہوا ہے ابھی۔"

وہ بولیں "بہو اس کی پریکشا قریب آرہی ہے نا، پڑھنے کے لیے سویرے اُٹھنے والا ہے وہ .... اور کل بخار بھی تھا اسے، کہہ تو رہا تھا۔"

چھوٹے دیور کے بخار کے تو روز ہی لاڈ چار ہوا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کو بتائیں تو وہ کہتے ہیں "اسے کچھ نہیں ہوا ہے، آپ اس کی شادی کر دیجیے۔" لیکن اماں کہتی ہیں "تعلیم پوری ہونے سے پہلے شادی نہیں ہو سکتی" ان کا جی چاہتا ہے چھوٹے دیور خوب پڑھ لکھ لیں۔ اور ہمارے مسٹر سے بھی زیادہ تنخواہ پائیں۔ سب لوگ کیوں "ان" سے اتنا بیر رکھتے ہیں؟"

میں نے آہستہ سے کہا "بہت ہو چکے چونچلے"

فوراً پوجا گھر سے آواز اُبھری "کیا کہا؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں" اور چھوٹے دیور جی کو جگانے کے لیے چلی گئی۔ وہ بستر پر پڑے جاگ ہی رہے تھے اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ میں نے دروازے ہی میں کھڑے ہو کر کہا "بھیا! اماں جگانے کے لیے کہہ رہی ہیں۔"

دیور جی کا چہرہ اور بھی لمبوترا لگنے لگا۔ پھر بولے "بھابی ذرا یہاں آؤ، دیکھو مجھے بخار تو نہیں ہے؟"

"مجھے نہیں آتا بخار دیکھنا، میں کرشنا کے ہاتھوں تھرمامیٹر بھجوا دیتی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

چھوٹے دیور جلدی سے بولے "ارے، لیکن ...."

"جلدی سے نیچے آجائیے ورنہ چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

وہ بولے "تم اوپر ہی لے آؤ چائے۔"

میں نے کہا "مجھے کام ہے۔"

چھوٹے دیور نے بستر پر ہی میں تھوڑا سا اُٹھ کر کہا "بھابی میری داڑھی بڑھی ہوئی تو نہیں ہے؟"

میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم" اور نیچے جانے لگی تو زینے میں "وہ" مل گئے۔

"کیوں اٹھا نہیں اب تک وہ مورکھ!"

"بس اُٹھ ہی رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

وہ غصے میں بھرے ہوئے دیور جی کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کی میز پر پڑی ہوئی انگریزی کی ساری ناولیں اٹھا کر پھینک دیں اور کورس کی کتاب ان کے ہاتھ میں دے کر زبردستی انھیں کرسی پر بٹھا دیا۔

ہنستے ہنستے میرا بُرا حال ہو گیا۔ اتنے میں سُسر جی کے کمرے کے بند دروازے کی اور میرا دھیان چلا گیا اور میں دہل کر چپ ہو گئی۔ ہمارے سُسر جی بہت تیز مزاج اور ہوشیار انسان ہیں۔ اکثر اپنے کمرے کا دروازہ بند کیے بیٹھے نہ جانے کون سے حساب کیا کرتے ہیں۔ گھر میں کیا چل رہا ہے، اس کی انھیں خبر ہی نہیں ہوتی۔ البتہ وہ کسی کو سبق سکھانا چاہیں تو پھر اس کی شامت ہی آجاتی ہے۔ وہ ہر روز شام کو باہر نکل جاتے ہیں اور پھر رات گئے پان چباتے ہوئے گھر لوٹتے ہیں۔

میں زینے میں چپ سادھے کھڑی رہی تاکہ دیور جی کے کمرے سے شریمان جی کے باہر نکلتے ہی ان کا ایک مرتبہ سامنا ہو جائے۔ اتنے میں سُسر جی کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھُلا اور منجھلی دیورانی چائے کی خالی پیالی لے کر باہر نکلیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اِس بُری طرح چونکیں کہ چائے کی پیالی ان کے ہاتھ سے گر کر کھَن سے ٹوٹ گئی۔ میں چپ چاپ زینے سے اُتر کر نیچے چلی گئی اور پھر تھوڑی دیر تک میرا من کسی کام میں نہ لگ سکا۔

منجھلی دیورانی البتہ رسوئی میں اپنے پتی پر غصہ نکال رہی تھیں، "بس بیٹھے رہتے ہیں۔ ذرا وہ ناریل توڑیئے......." اور جاتے جاتے وہ پیڑا بچھاتے جائیے۔" اور منجھلے دیور جی بڑے آرام سے گھر کے سارے کام کرتے جا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر میری حالت چوروں جیسی ہو رہی تھی۔

سب لوگ کھانا کھانے بیٹھے تو میں نے گھی پروسنا شروع کر دیا۔ گھی اور دہی پروسنے کا کام اماں

ہمیشہ اپنے ہاتھ میں لیا کرتی ہیں۔ اس وقت چھوٹے دیور جی کی تھالی میں دو چمچے گھی زیادہ گر جاتا ہے اور کرشنا اور ان کی تھالی میں نہیں کے برابر۔ اسی لیے گھی ڈالنے کا کام میں نے جان بوجھ کر اپنے ذمّے لے لیا۔ سسُر جی کو چمچا بھر گھی دے کر میں آگے بڑھنے ہی والی تھی کہ وہ بولے "رک کیوں گئیں؟ میں نے بس تو نہیں کہا۔"

میں نے اور گھی ڈالا پر مجھے خواہ مخواہ ڈر سا لگنے لگا۔ اتنے میں انھوں نے بھی مجھے گھور کر دیکھا۔ ایک سے زیادہ مرتبہ ایسا کچھ ہو جائے تو انھیں لگتا ہے میں بڑی لچی، جھگڑالو، اور چغل خور ہوں۔

کھانا ختم ہوتے ہی میں جلدی جلدی سب سمیٹ ڈھانک کر اوپر گئی تو دیکھا جناب کپڑے پہن کر باہر جا چکے تھے۔ اتنا غصّہ آیا۔

پرلی جانب کے کمرے سے منجھلی دیورانی کی ڈانٹ سنائی دی۔ میں فوراً کان لگا کر سننے لگی۔ منجھلی دیورانی کہہ رہی تھیں "ڈاڑھی کتنی بڑھا رکھی ہے۔ ذرا آئینہ تو دیکھیے۔"

"رہنے دو، کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"ہوں، آپ اس طرح ہونّق بنے پھرتے ہیں اور مجھے یہاں وہاں شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔"

"پھر کیا کہتی ہو تم؟ اب کر لوں ڈاڑھی؟"

"نہیں، نہیں، کیوں کرتے ہیں مجھ پر اتنا احسان!"

"تمہیں تو کوئی بات پسند نہیں آتی۔ جاؤں میں اب؟"

"مجھے دس روپے دیجیے۔"

"دس روپے! مہینے کے اخیر میں کہاں سے لاؤں اتنے روپے؟"

ہچکیاں، منانا، رونا، منت سماجت کرنا، ڈانٹنا۔

آخر منجھلے دیور جی اترا ہوا چہرہ اور جھکی ہوئی گردن لے کر زینہ اتر گئے۔ منجھلے دیور جی بھی عجیب انسان ہیں۔ منجھلی دیورانی ان کو جتنا ڈانٹتی پھٹکارتی ہیں وہ اتنا ہی ان کے آگے بھیگی بلی بنے رہتے ہیں۔

دوپہر کو برتن مانجھ کر اوپر جانے ہی والی تھی کہ کوکن سے اماں کے بھائی کی لڑکیاں ہمارے ہاں آگئیں۔ ان میں باہر نکلے ہوئے دانتوں والی بولی "پھوپی، پھوپی تمہارے لیے کوکن سے گنڈیریاں لائی ہیں اور ادرک کا جو بھی"۔ اور گنڈیریوں کے چند ٹکڑے اور مٹھی بھر کا جو اماں کے سامنے ڈال دیے۔

اماں ایک دم کھل گئیں اور بولیں "بہت اچھا کیا بیٹی! آج کل اتنا خلوص بھی کون دکھاتا ہے۔"

"پھوپی کیسی باتیں کرتی ہو؟ تمہارے لیے خلوص نہیں ہوگا تو اور کس کے لیے ہوگا؟"

"اری ایسا تو تم لوگوں کو محسوس ہوتا ہے۔ ورنہ اس گھر میں تو میرا ہونا ہی بُرا لگتا ہے لوگوں کو۔"

"اچھا تمہاری بہویں اس حد تک جا چکی ہیں! انھیں بُری لگتی ہو تو کیا ہیں تو اپنی لگتی ہو۔ اب ہمارے ساتھ کوکن میں چلو۔"

پھر تھوڑی ہی دیر میں گھر کے کونے کھدرے ٹٹولے جانے لگے۔ اچھے خاصے سبک بناوٹ کے دو بیسن کے ڈبے غائب ہوگئے، صندوق میں رکھی ہاتھی دانت کی کنگھیاں لاپتا ہوگئیں اور نہ جانے کتنی چھوٹی موٹی چیزیں گم ہوگئیں۔ منجھلی دیورانی نے جلدی جلدی اپنی ساری چیزیں ٹرنک میں بند کر کے تالا ڈال دیا۔ مجھے نہیں سوجھی یہ ترکیب۔ نتیجے میں میری دو ساڑیاں غائب ہوگئیں۔ آخر میں میرا ایک ریشمی جمپر سینے سے لگاتے ہوئے ایک بولی" پھوپی! مجھے بالکل ٹھیک بیٹھے گا نا یہ پولکا؟"

اماں بولیں" تو پھر لے کیوں نہیں جاتی۔ وہ سلوا لے گی نیا۔ یوں بھی ٹرنک کے ٹرنک بھرے پڑے ہیں کپڑوں سے۔ کیا کرنے ہیں اتنے ڈھیر سارے کپڑے!"

کیا بتاؤں کتنا غصّہ آیا مجھے۔ انھوں نے بڑے شوق سے اس جمپر کے لیے ریشمی ٹکڑا لا کر دیا تھا مجھے۔ لیکن بات جب اس سے بھی آگے بڑھی اور ایک چھوٹی لڑکی نے ان کے قلم کو ہاتھ لگایا تو میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ اس سے وہ چھین لیا۔ اس لڑکی نے اماں سے شکایت کرنے کی کوشش کی لیکن اماں کو وہ شکایت سنائی ہی نہیں دی۔ ہمارے صاحب کا گھر میں دبدبہ ہی ایسا ہے۔

ان سب کے لیے سوجی اور چائے بناتے بناتے میری جان نکل گئی اور ان مُوئیوں نے کھایا بھی اتنا کہ دو نوالے تک نہیں چھوڑے۔ جیٹھانی جی کا کرشنا بے چارا اتنا سا منہ لیے آس پاس پھرتا ہی رہ گیا۔ جانے سے پہلے ان لڑکیوں نے ایک مرتبہ پھر دیواروں پر لگے تختے ٹٹول ڈالے۔ اماں جہاں پیسے رکھتی ہیں وہ کونے والا تختہ بھی۔ لیکن مجھ مت ماری کو اس وقت کوئی شک نہیں ہوا۔

آخر پانچ بجے مجھے اوپر جانے کی فرصت ملی۔ چھوٹے دیور جی کالج سے واپس آچکے تھے۔ بولے" چلو بھابی کیرم کھیلیں۔"

میں نے کہا" میرا سر دکھ رہا ہے۔" اور کمرے میں جا کر اندر سے کنڈی چڑھا لی۔ انھوں نے ایک کتاب پڑھنے کی تاکید کی تھی لیکن کتاب پڑھنے لگتی ہوں تو مجھے نیند آنے لگتی ہے ذرا آنکھ لگ رہی تھی کہ

نیچے اماں کا چیخنا چلانا شروع ہو گیا اب کیا ہو گیا کون جانے ؟ ۔

اتنا غصہ آیا مجھ کہ جس کی حد نہیں۔ آپ کو سُن کر ہنسی آئے گی لیکن مجھے غصہ آ جائے تو کچھ نہ کچھ کھانے کو جی کرنے لگتا ہے۔ جی چاہا لوکی کا حلوا منگا کر کھا لوں ڈھیر سا۔ میں نے اپنی پیٹی کھولی تو کھلے پیسے ہی نہیں تھے۔ آخر پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور جانکی نوکرانی کی لڑکی کو لوکی کا حلوا لانے کے لیے کہنے کی خاطر دبے پاؤں نیچے اتری لیکن پچھواڑے پہنچنے سے پہلے ہی اماں نہ جانے کدھر سے آ ٹپکیں اور بولیں "کہاں جا رہی ہو؟"

میں چونک پڑی "کہیں تو نہیں" اور میرے ہاتھ سے پانچ روپے کا نوٹ نیچے گر پڑا۔

اماں نے نوٹ دیکھا اور سر پر ہاتھ مار کر بولیں "ہار گئی بابا میں تو تم سے!"

میں نے گھبرا کر پوچھا "کیا ہوا ؟"

"شاباش! اور مجھی سے پوچھتی ہو کہ کیا ہوا۔ میرے تختے پر سے پانچ روپے تمہیں نے اٹھائے ہیں نا"

"جی نہیں، میں نے نہیں لیے یہ میرے پانچ روپے ہیں"

"اچھا، اچھا کہتی ہو میرے ہیں۔ پھر ہاتھ میں پانچ کا نوٹ لے کر پچھواڑے یوں چوروں کی طرح کیوں ٹہل رہی ہو ؟"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دوں۔ میں ایک دم بوکھلا گئی تھی۔ گھر کے سارے لوگ میرے ارد گرد جمع ہو گئے اور جس کے جو منہ میں آیا کہنے لگا۔ آخر سسُر جی نے مجھے آواز دی۔ مجھے ایک دم سے رونا آ گیا۔ آج تک کسی نے مجھ پر ایسا الزام نہیں لگایا تھا۔ اگر انھیں، یقین آ گیا تو ......؟

سسُر جی نے شانت لہجے میں پوچھا "بہو، تم نے لیے ہیں وہ پانچ روپے؟"

ان کے شانت انداز سے میں اور بھی گھبرا گئی۔ اتنے میں وہ، کام پر سے واپس آ گئے۔ سسُر جی کے کمرے میں داخل ہو کر بولے "کیسا ہنگامہ ہے ؟"

چھوٹے دیور جی نے فوراً نمک مرچ لگا کر سارا قصہ بیان کیا۔ میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا "آپ کے سر کی قسم میں نے پیسے نہیں چرائے!"

انھوں نے ایک مرتبہ میری طرف دیکھا اور زور سے بولے "کیا حماقت ہے! وہ چوری وری ہرگز نہیں کر سکتی، کیا میں اُسے پیسے نہیں دیتا۔"

یہ سنتے ہی سب خاموش ہو گئے۔ سسر جی بھی۔ میں موقع غنیمت جان کر وہاں سے سٹک گئی اماں تو ایسی تلملائیں کہ کیا کہوں۔ اتنے میں جیٹھانی جی کا کرشنا بے وقوفوں کی طرح وہاں آنکلا۔ اماں نے فوراً اس کی بانہہ پکڑلی اور بولیں "موئے تو نے ہی چرائے ہوں گے پیسے!" اور اسے بے تحاشا مارنے پیٹنے لگیں۔

وہ رو رو کر کہنے لگا "قسم سے میں نے نہیں چرائے پیسے، قطعی نہیں چرائے۔" لیکن اس بے چارے کی کون سنتا ہے؟۔

اتنے میں مجھے تختے ٹٹولنے والی لڑکیوں کا خیال آگیا اور جی چاہا جا کر ابھی اپنا شک ظاہر کر دوں اور کرشنا کو چھڑا لوں۔ لیکن مجھے ڈر لگنے لگا اور پھر "وہ منظر نہ دیکھنا ہی اچھا" یہ سوچ کر میں وہاں سے ہٹ گئی۔ بغل کے کمرے میں جیٹھانی جی دیوار سے چپکی کھڑی تھیں اور کرشنا کو ہونے والی مار پیٹ سن رہی تھیں کرشنا زور سے چلایا تو انھوں نے منہ میں ساڑی کا پلو ٹھونس لیا۔ کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ پھر بھی ان کا بدن ہچکیوں سے ہل رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔

ان کی یہ حالت دیکھ کر میں گھبرا گئی۔ ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر انھیں گھر کے اندر لے جانے کو جی چاہا لیکن ان کے قریب جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ آخر جیٹھانی جی کی حالت ان کے کانوں تک پہنچانے کا ارادہ کر کے میں اوپر کمرے میں گئی۔

اوپر جا کر دیکھا تو جناب آئینے کے سامنے کھڑے ہاتھ ہلا ہلا کر اور منہ بگاڑ بگاڑ کر انگریزی میں زور زور سے جانے کیا کیا بول رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر ایک دم میرے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑا۔ میں پلنگ پر بیٹھ کر پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگی۔

وہ پہلے تو چونکے پھر مجھ پر برسنے لگے۔ لیکن نہ انھیں غصہ کرنا آتا ہے اور نہ مجھے ہنسی روکنا۔ آخر انھوں نے بھی ہنسنا شروع کر دیا۔

اور پھر جیٹھانی جی کی بات جہاں کی تہاں رہ گئی۔

اروند گوکھلے

کھیل

خشک نالے پر بنی ہوئی پتھریلی مینڈ زیادہ بلند نہ تھی۔ لیکن سُبھاش اور گمپو کو اس پر چڑھ بیٹھنے کے لیے کافی کوشش کرنی پڑی گھٹنے چھل گئے، نیکر کی جیبوں میں بھرے کٹھل اور املیاں نکال کر مینڈ پر رکھ دینی پڑیں۔ پھر نیکر سنبھالتے اور ناک صاف کرتے ہوئے دونوں اوپر چڑھ بیٹھے۔ پیچھے مُڑ کر دیکھا تو پانی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ برسات میں بھی وہاں سے پانی کا بہاؤ بہت ہلکا رہتا ہوگا۔ سارے میں گھاس اُگی ہوئی تھی، جنگلی خاردار پودے تھے اور ان کے درمیان ہڈیاں، ٹین کے ڈبے، کانچ کے ٹکڑے، کپڑے کی دھجیوں کا ایک بقچہ سا پڑا ہوا تھا۔ گردن موڑ کر وہ دونوں بڑی دیر تک اس خزانے کا جایزہ لیتے رہے۔

ایک شخص ہاتھ چھوڑ کے سایکل چلاتا ہوا اور کوئی فلمی گیت گاتا ہوا وہاں سے گذرا۔ سبھاش اور گمپو کی توجہ ادھر منتقل ہوگئی۔ توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں بے سُرے پن سے گاتے ہوئے آگے بڑھنے والے سایکل سوار کو دیکھ کر انھیں بڑا لطف آیا۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہونے تک وہ اس سمت نظریں جمائے رہے۔ اس کے جانے کے بعد سارا لطف جاتا رہا۔ سناٹا اور خالی پن اُبھرنے لگا۔

اس خلا کو پُر کرنے کے لیے گمپو نے پوچھا ــــ اب کیا کیا جائے؟''

سبھاش نے کوئی جواب نہ دیا۔ ٹیکری پر گھومنے پھرنے میں کافی وقت لگ گیا تھا۔ کٹھل اور املیاں اکٹھا کرنے میں، جنگلی پھول توڑ توڑ کر بکھیرنے اور راستے کے کنارے کھڑے ہو کر ہاتھ کرگھوں پر کپڑا بنتی ہوئی عورتوں کو دیکھنے میں بڑا مزا آیا تھا۔ جسم تھک گیا تھا، منہ کھٹا ہو رہا تھا

لیکن مزا لوٹنے کی ہوس ختم نہیں ہورہی تھی۔ اب اور کیا کیا جائے؟ گانو کی حد قریب آچکی تھی۔ دن بھی ڈھل رہا تھا۔۔۔

اچانک گمپو کو ایک دلچسپ بات یاد آئی۔ "بس۔۔ دیکھ ایک مزے کی بات۔۔۔۔"

"کون سی؟"

"کتنے بجے والی۔۔ کھیلو گے؟"

سُبھاش نے ایک طرف تھوک اچھال کر پسندیدگی کے اظہار میں گردن ہلائی۔ دونوں تن کر، چہروں پر معصومیت طاری کر کے تیار ہو بیٹھے۔ دن ڈھلنے سے پیشتر ایک پنشنر سیر کو نکل پڑے تھے۔ سر پہ پگڑی، گلے میں مفلر، پرانے جوتے اور موزے، ہاتھ میں چھڑی۔ اپنے خیالات میں مگن وہ راستے کے بیچوں بیچ چل رہے تھے۔ مینڈ کے پاس سے گزرنے لگے تو سُبھاش ایک دم بول اٹھا، "کیا بج رہا ہے جناب؟"

پنشنر چونک پڑے۔ ایسے گھبرائے جیسے ان پر موٹر چڑھ آئی ہو۔ پھر خود کو سنبھال کر بولے "اں۔۔ کیا بجا ہے۔۔" جیب سے گھڑی نکال کر سوئیاں دیکھیں۔ "ساڑھے چار۔۔۔ ساڑھے چار بج کر تین منٹ"۔ پھر پوچھنے والے کی تلاش میں نظریں دوڑائیں اور سامنے کی منڈیر پر بیٹھے ہوئے لڑکوں کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

ان کے آگے بڑھتے ہی سُبھاش نے مسکرا کر گمپو کو آنکھ ماری۔ گمپو کچھ سرکا اور سُبھاش کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ دور سے ایک سائیکل سوار آتا ہوا دکھائی دیا۔ گمپو جلدی سے بولا "اب میں۔"

سائیکل سوار ہانپتا ہوا پیڈل مار رہا تھا۔ کسی فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ خود ہی بڑبڑا رہا تھا۔ سامنے آتے ہی گمپو نے ہانک لگائی۔ "مسٹر کیا بج رہا ہے؟۔ ٹائم کتنا ہوا؟" پورا جملہ ادا کرنے میں اسے کچھ دیر لگ گئی۔ اس کو شبہ ہوا کہ سائیکل سوار مراٹھی داں نہیں ہے اس لیے اس نے لفظ "ٹائم" کو زور سے ادا کیا۔

ہاف پاسٹ فور" گھڑی اور بچوں کی طرف دیکھے بغیر وہ شخص بولا اور بدبداتا، پیڈل چلاتا آگے بڑھ گیا۔ اس کی کہی ہوئی بات سمجھ میں نہ آسکی لیکن دونوں دیر تک پیٹ پکڑے

ہنستے رہے۔ پھر دو کالج کے طالب علم گزرے۔ ایک پولیس والا گیا اور سبزی کا گٹھر لادے ایک سائیکل سوار بھی نکلا چلا گیا۔ ایک خوش پوش صاحب گزرے۔ سبھاش اور گمپو نے سب کو ٹوکا اور بڑی فکرمندی سے پوچھا "کتنے بجے ہیں؟" ہر آدمی نے ٹھٹھک کر انھیں جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔ وقت گزر رہا تھا۔ چھوٹے بچوں کے راستہ چلتے میں ٹوک دینے پر خفگی کا اظہار کرنے والوں پر وہ دونوں ہنس رہے تھے۔ انھیں بھرے بازار میں کسی کی ٹوپی اچھالنے کا سا لطف آرہا تھا۔ املیوں پر پتھر برسانے اور ماسٹر صاحب کی آنکھ بچا کر اسکول سے بھاگ آنے سے زیادہ اس کھیل میں لطف آرہا تھا۔

"چل اب گھر چلیں" گمپو مینڈپر سے چھلانگ لگاتا ہوا بولا۔

"کیوں تھک گیا کیا؟ — کتنا مزا آرہا ہے۔ رک جا ابھی اور لوگ آئیں گے!" سبھاش نے گمپو کی بانہہ کھینچتے ہوئے کہا۔ "اس جنٹلمین کی تو اچھی قلعی اتری کیوں؟ ٹھاٹ سے کلائی پر نظر ڈالی تو گھڑی ہی غائب — اور اس گٹھر والے سے پوچھا تو کیسا بگڑا تھا۔ ارے آنا!" سبھاش اس کھیل میں کھو سا گیا تھا۔ گزشتہ اتوار کو چوک میں کیلے کے چھلکے پھینک کر آنے جانے والوں کے پھسل کر گرنے کا تماشا دیکھنے کی ترکیب کامیاب نہ ہوسکی تھی لیکن اس سے بڑی تفریح حاصل ہوجانے کی مسرت اب اس کی آنکھوں میں کھیل رہی تھی۔

لیکن گمپو اس سے زیادہ سنسنی خیز تفریح چاہتا تھا۔ محض وقت دریافت کرنا بھی کوئی کھیل ہوا؟ املیاں کھانے اور بڑوں کی کھلّی اڑانے کے لیے وہ کوئی چھوٹا بچہ تھوڑی ہے وہ سبھاش کو نیچے گھسیٹنے ہی جا رہا تھا کہ اچانک ایک جوڑا آتا دکھائی دیا۔ وہ رک گیا اور آہستہ سے بولا — "سبھاش جانے دینا۔"

سبھاش جھک کر دیکھنے لگا۔ اپنی میلی نیکر اور دھول میں اٹے بالوں پر اسے شرم آنے لگی۔ اس نوجوان کے پاجامے کی استری کتنی اچھی تھی، کرتا بھی کیسا بھولا بھولا سا لگتا تھا۔ کسی فلمی اداکار کی طرح اس نے بال سنوار رکھے تھے، پیشانی پر جھکے ہوئے۔ اور — اور بائیں ہاتھ سے اس نے لڑکی کی کلائی تھام رکھی تھی، جہاں گھڑی بندھی ہوئی ہے وہاں اس کا پنجہ دھرا ہوا تھا۔ وقت پوچھنے کے بجائے سبھاش منہ کھولے اس لڑکی کو تکتا ہی رہ گیا۔

منہ سے کچھ بولے بغیر وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کاندھے سے کاندھا ملائے ان کے سامنے سے گزر گئے۔ املیوں اور کٹھلوں کی ساری لذت چھین لے گئے، آنکھوں کی ساری شرارت آمیز چمک ماند پڑ گئی، گمپو ناخن کاٹتا ہوا کھڑا رہ گیا، سبھاش آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔

اس جوڑے کے گزرنے کے کافی دیر بعد ایک مال ٹرک کھڑکھڑاتا دھول اڑاتا چلا گیا اور دونوں چونک پڑے۔ آنکھیں ملتے اور ناک صاف کرتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"گھر چلیں؟"

"گھر؟"

گھر لوٹنے کی خواہش دونوں کو نہیں تھی۔ ماں۔ باپ، بھائی، بہن، دانتا کلکل، اندھیرا اور دھواں، بیزاری .....

"اب کچھ اور کریں؟"

"کیا کیا جائے؟ تھیٹر پر چل کر تصویریں دیکھیں! آئیڈیا!"

گمپو کا "آئیڈیا" سبھاش کے دل کو نہیں لگا۔ لیکن ایسی ہی کوئی تند و تیز، تھرتھرا دینے والی بات چاہیے تھی۔ کھیل اور یہ مذاق بے مزا لگ رہا تھا۔ کوئی بہت ہی دلچسپ ——— پوشیدہ ——— اور .....

گمپو کا دماغ ایسی باتوں میں خوب کام کرتا تھا لیکن اس مرتبہ سبھاش کے ذہن میں وہ بات آئی جو بر وقت اور ضروری تھی۔ "چل ——— آ میرے ساتھ ——— بتاتا ہوں" گمپو کو گھسیٹتے ہوئے وہ بولا۔

"کہاں ——— پہلے بتا!" گمپو بیوقوفوں کی طرح راستے ہی میں اڑ گیا۔ سبھاش اسے کنارے لے جاکر آہستہ سے بولا

"تھیٹر میں نہیں ——— اس طرف کی موتری میں ———"

"کس لیے؟ چل ہٹ۔" گمپو منہ بناتا ہوا بولا۔

"وہاں دیواروں پر لکھتے ہیں نا !"

" کیا ؟ ہم بھی لکھیں ؟ نا بابا" دیوار پر واہی تباہی، گندی باتیں لکھنے کے تصور ہی سے گمپو کو جھرجھری سی آگئی۔

"نہیں یار، جو لکھا ہوتا ہے، وہ پڑھیں گے۔ بڑا مزا آتا ہے ان باتوں کے پڑھنے میں۔"

" لکھنے سے زیادہ پڑھنے میں لطف آنے والی بات گمپو کے دل کو لگ گئی۔ الفاظ کا صحیح مطلب چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے، وہ باتیں بڑی انہونی، راز دارانہ، تھرتھرا دینے اور بڑے ہو جانے کا احساس پیدا کرنے والی ہوتی تھیں۔ بڑوں کی طرح چوری چھپے کھیلا جانے والا یہ کھیل آزمانے کے لیے گمپو بھی بے تاب ہو اٹھا۔ بغیر سوچے سمجھے آگے بھاگا۔ سبھاش بھی خوش ہو کر اس کے پیچھے دوڑا۔

املیوں سے پیٹ اور جیبیں بھر چکی تھیں۔ وہ جوڑا کہیں دور افق میں گم ہو چکا تھا۔ سامنے تھیٹر بالکل قریب تھا۔ اس سے لگی ہوئی موتری کی دیواروں پر لکھی ہوئی باتیں پڑھنے کے لیے وہ دونوں ناک صاف کرتے نیکریں اوپر کھینچتے ہوئے، بڑی بے صبری سے دوڑ پڑے تھے۔ دونوں کے چہروں سے خطا کاری جھلک رہی تھی۔

نارائن گنیش گورے

آہیں

جس لمحے کا خوف میرے ذہن پر عمر بھر سوار رہا وہ لمحہ آج میرے سامنے آکھڑا ہوا ہے۔ لیکن میں نے اس لمحے کو جتنا بھیانک سمجھا تھا اتنا بھیانک آج نہیں لگ رہا ہے۔ ایسا کیوں؟ شاید خوفناک لمحات درحقیقت اتنے خوفناک نہیں ہوتے جتنا ہمارا تصوّر انھیں بنا دیتا ہے۔ لیکن اس سچائی کو کیسے جھٹلا دوں کہ میری امیدوں کے پھول کھلنے سے پہلے ہی مرجھاتے رہے اور پندرہ سال تک چلنے والا یہ کھیل آج ختم ہو چکا ہے۔ عمر بھر میرا من آنسو بہاتا رہا اور اب آخری بار ہچکیاں لے رہا ہے۔ اب میں نہیں روؤں گی۔ جب تک تم رہے میرے ساتھ تب تک امیدیں اور آشائیں رہیں اور اسی لیے شکوے گلے ہوا کیے۔ اب کیسی آشائیں اور کیسے گلے؟ اب کس کے خلاف شکایتیں ہوں گی؟ آج جو میرے دل سے آہیں اٹھ رہی ہیں وہ تمہارے خلاف شکایت کے طور پر نہیں۔ میں تمہیں اس آخری لمحے میں کیسے دکھ پہنچا سکتی ہوں، عورتوں کا یہ رونا تو ازلی ہے۔ اُرملا نے لکشمن اور یشودھرا نے سدھارتھ کے لیے انھیں جذبات کا اظہار کیا تھا نا؟ اس کا ان پر کیا اثر ہوا؟

یہ لمحہ کتنا نازک ہے۔ دھوپ کی تیزی کم ہو چکی ہے اور سردیوں کی پیغامبر نرم ہوا چل رہی ہے اور اس کے جھونکے کھیتوں میں دال کی بیلوں کو کھنیاتے، ندی کے سینے پر کپکپی پیدا کرتے وشویشور کے مندر کی طرف بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ سفید براق پھولوں کی مالاؤں سے ڈھکا ہوا تمہارا جسم کتنا لاغر نظر آرہا ہے۔ آج صبح جب موت کی دیوی نے تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تو تم مسکرا دیے تھے۔ وہ مسکراہٹ اب بھی تمہارے چہرے سے چمٹی ہوئی ہے۔ تمہارے سنگ مرمر جیسے سفید اور سرد ماتھے پر بکھرے بال ہوا سے ہل رہے ہیں۔ یہ شام کی ہلکی کرنیں، یہ ہوا کے نرم جھونکے، یہ تمہارا سرد جسم، تمہارے چہرے کی یہ مسکراہٹ، سامنے تیار ہو رہی چتا اور اس سارے منظر کو حیران نگاہوں سے دیکھنے والے سری کے ننھے ننھے ہاتھوں کا میرے

کاندھوں کو محسوس ہونے والا لمس۔ ان سب باتوں کی وجہ سے میری آنکھیں نم ہوئی جارہی ہیں۔

...... لو وہ آخری لمحہ بھی آپہنچا۔ اب تم چتا پر سو رہے ہو۔ اب لکڑیوں سے نہ صرف تمہارا جسم بلکہ چہرہ تک ڈھک گیا ہے۔ اب آگ کی لمبی لمبی زبانیں تمہیں اپنی لپیٹ میں لے رہی ہیں۔ یہ اگنی مجھ سے کہہ رہی ہے کہ آج سے تقریباً بیس برس پہلے میں نے اس کا ہاتھ تیرے ہاتھوں میں دیا تھا۔ اب میں ہی اسے لے جارہی ہوں۔

جس وقت آگ کی پہلی لپیٹ نے تمہاری چتا پر سر اُبھارا اور کالا دھواں اوپر اٹھا اس وقت میرے اندر۔ میرے من میں ایسی ہلچل مچی جیسے سمندر میں طوفان آیا ہو۔ اِس وقت آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں اور ان کی تپش سے میرے من کا سوگ بھاپ بن کر اُڑتا جارہا ہے اور میں اندر سے خالی اور خشک ہوتی جارہی ہوں۔ ابتدا میں اٹھنے والی درد کی لہریں ناقابلِ برداشت تھیں۔ لیکن اس خیال نے بڑی تسکین پہنچائی تھی کہ یہ درد کا احساس میرے جذبات کے زندہ ہونے کی دلیل ہے .... لیکن اب اس اطمینان کی جگہ خوف لے رہا ہے کسی اجاڑ مندر کے اندرونی حصے میں داخل ہوتے وقت جیسا خوف محسوس ہوتا ہے ویسا ہی مجھے اپنے دل سے خوف آرہا ہے۔

اب میں سچ مچ اکیلی ہوگئی۔ گزشتہ پندرہ سال سے میں تنہا ہی تھی لیکن چانک کی طرح چونچ کھولے تمہاری طرف دیکھتی رہی تھی۔ سورج مکھی کی طرح تمہیں سورج مان کر رخ پھیرتی رہی تھی۔ من کہتا جس فراخدلی سے تم اوروں کو پیار بانٹتے ہو وہ میرے نصیب میں بھی آکے رہے گی۔ تمہارا پریم میرے حصے میں بھی آئے گا۔ نوکری پر جاتے وقت بلیک بورڈ پر پارٹی کے جلسے کی اطلاع اور تمہارا نام دیکھ کر ایک جھرجھری سی محسوس ہوتی۔ ایک من کہتا "آج شام کو جب تم گاؤں میں آؤ گے تو گھر ضرور آؤ گے" دوسرا من کہتا "تم کیسے آسکو گے بھلا؟" پھر بھی شام سے لے کر بتی گل کر کے تھکا ماندہ جسم بستر پر پھینکنے تک بیسیوں مرتبہ دہلیز تک جاکر واپس آیا کرتی تھی۔ لیکن تمہیں یہ کب یاد رہتا تھا کہ دنیا میں کوئی تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔ تمہیں لیمو کا شربت پسند تھا۔ آنگن کے لیمو کے پیڑ سے رس بھرے لیمو توڑتے وقت خیال آتا کہ آج تم آجاؤ تو کتنا لطف رہے۔ ہاں تم کبھی کبھار آبھی جایا کرتے تھے۔ آنگن میں آکر جب تم "کیسے تاتیا" کہہ کر آواز لگاتے تو چولہے پر ابلتا دودھ چھوڑ کر میں اوپری منزل کی گیلری میں آکھڑی ہوتی تھی۔ میری خواہش ہوتی کہ پڑوس کے تاتیا کے ہاں اخلاقاً جھانک کر تم فوراً اوپر آجاؤ اور شریر شری کی دونوں بانہیں تھام کر اسے اوپر اٹھا لو اور مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہو۔ "کیوں رے شریر، بہت بدمعاشیاں کرنے لگا ہے تو۔"

پھر میری طرف دیکھ کر کہو۔" اس کی خوب پٹائی کیا کرو!" اور پھر میں جواب دوں " میری دھمکیوں کا کہیں اثر ہو سکتا ہے اس پر ــــ بالکل آپ پر گیا ہے وہ۔" اور تم جواب دو " کس پر پڑا ہے یہ بعد میں دیکھا جائے گا پہلے کھانا لگاؤ۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔ صبح سے پیٹ میں اناج نہیں گیا ہے۔" اور میں کھانا پروسنے میں لگ جاؤں۔

کبھی کبھی میرا دل چاہتا۔ کہ شری کے ساتھ ہم دونوں کی ایک تصویر کھنچوائی جائے۔ تم نہ سہی تمہاری تصویر تو ساتھ رہا کرے گی۔ کبھی خواہش ہوتی کہ تینوں مل کر چند روز کے لیے کہیں رشتے داروں کے ہاں چلے جاتے۔ یہ نہیں تو کم از کم کسی شام کو گھر سے باہر سیر کو نکل جاتے۔ راستے میں کوئی دوست تمہیں روک کر چھیڑتا "آج یہ انقلاب کیسا؟ آج فرصت کیسے نصیب ہو گئی؟" یا مجھے کوئی سہیلی ستانے لگتی۔ "آج محترمہ بہت خوش نظر آ رہی ہیں۔" اور میں لاج کے مارے منہ چھپانے لگتی، خوشی سے مدہوش ہو جاتی۔ لیکن یہ سب ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ کتنی سادہ سی مانگیں تھیں میری! لیکن ایک بھی پوری نہ کر سکے تم۔ میرے من کی بیل اوپر چڑھنے کے لیے سہارے ڈھونڈتی تھی۔ لیکن ہمارے جیون میں ایسے سہاروں کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

مجھے اکثر تعجب ہوتا تھا کہ تم صرف مجھی سے اتنی بے رخی کیوں برتتے ہو؟ کیسے برت سکتے ہو؟ کیا میں تمہاری بیوی تھی اس لیے؟ اگر میں کسی اور کی گھر والی ہوتی تو؟ کوئی بیوہ ہوتی تو؟ یا کوئی مطلقہ بلکہ کسی کی ہوس کا شکار بے سہارا عورت ہوتی تو کیا ہوتا؟ تم مجھ سے کتنے خلوص سے پیش آتے۔ مجھے نہ جانے کتنے پریم سے سمجھاتے اور کچھ نہ کچھ کرتے رہنے پر اکساتے۔ بن میں پتھر کی سل بن کر پڑی ہوئی اہلیہ کو نجات دلانے والے رام چندر جی نے گھر کی سیتا کو ایک پتھر کے سمان سمجھا اور دھتکار دیا۔ وہی کہانی دہرائی جا رہی تھی۔

آج میرا انتظار بے چینی بھاگتا ختم ہو چکا ہے سچ پوچھو تو میں خود بھی جسمانی اور ذہنی طور پر اس تعاقب سے تھک چکی تھی "تھک گئیں تم؟" یہ سوال تم ہرگز کرنے والے نہ تھے اس لیے تھکن اور ٹوٹن کا احساس اور شدید ہو گیا تھا۔ تمہارا سایہ بننے کی کوشش میں نے گذشتہ پندرہ سال سے مسلسل جاری رکھی تھی مگر لوگ اس تعاقب کو تمہیں اپنے پنجۂ ہوس میں گرفتار کرنے کی کوشش قرار دیتے تھے اور غیر کیوں تم خود بھی تو ایسا ہی محسوس کرتے تھے نا؟ جب تمہیں بھی اس کا یقین ہو چلا کہ تمہارا اور میرا رشتہ صید اور صیاد کا رشتہ ہے تو میرا دل گھایل ہو کے رہ گیا۔ تیر تو مجھے لگا تھا، تمہیں کون سا ضرر پہنچا؟ اپنا گھر سنسار سنوارنے کی خواہش میرے من میں تڑپ رہی تھی۔ لیکن تمہیں تو ساری دنیا کا بگاڑ ختم کرنے کی فکر لگی ہوئی تھی۔ تمہاری اس

جدوجہد میں کوئی رکاوٹ نہ پڑے اس لیے میں نے تم پر بوجھ نہ بننے کا فیصلہ کرلیا۔ سوچا میں پنکھ ٹوٹنے تک اڑتی پھروں گی۔ ایک ایک تنکا لاکر اپنا گھونسلا بناؤں گی اور پھر چھپا کر تمہیں پکاروں گی "میرے راجا اڑو نا۔ تم تھک گئے ہوگے کچھ دیر سستالو۔ چونچ سے چونچ ملاکر اور پروں میں پر ڈال کر کچھ دیر بیٹھیں آؤ۔ پھر تم دوبارہ کھلے آسمان کی سیر کرنے نکل جانا" بڑی مجنونانہ خواہش تھی میری۔ بھلا تمہیں کیوں اچھی لگنے لگی یہ خواہش تم تو آشیاں کا سہارا لینا کھلے آسمان سے غداری کے مترادف سمجھتے تھے۔ پھر گھر تمہارے لیے قید خانہ کیوں نہ ہوتا؟

ایک مرتبہ صرف ایک مرتبہ مجھے ایسا لگا کہ میں کامیاب ہو رہی ہوں۔ جب تمہارے بازوؤں میں سما گئی تو مجھے ایسا لگا ساون میں آم پر لد کر مور آیا ہے، بے تحاشا لٹایا ہوا دھن مجھے واپس مل رہا ہے۔ اس روز تمہاری قربت نے مجھے اس طرح آسودہ کر دیا تھا جیسے گرمیوں میں تپتی ہوئی دھرتی بارش کی جھڑی لگنے پر آسودہ ہو جاتی ہے۔ لیکن صبح کو تمہارے سامنے چائے کی پیالی رکھتے وقت جب میں نے مخمور آنکھوں سے تمہاری آنکھوں میں جھانکا تو مجھے پتا چل گیا کہ میرا یہ اندازہ غلط تھا کہ تم میرے ہو چکے ہو۔ وہ ایک بھیانک خود فریبی تھی۔ جس وقت میری آنکھوں میں اُنماد کے رنگ جھلک رہے تھے، تمہاری آنکھوں میں اپرادھ کی پرچھائیاں تھیں۔ میرے جسم میں خود سپردگی بجلی بن کر دوڑ رہی تھی۔ لیکن تمہارے چہرے سے بھاری دان دے چکنے کے بعد طاری ہونے والی اداسی ٹپک رہی تھی۔ واقعی تم نے عرصے تک بچایا ہوا دان مجھ پر نچھاور کر دیا تھا اور بھاری اندوختہ کھو جانے پر اداس ہو بیٹھے تھے۔ اسی لمحے مجھے پتا چل گیا کہ جب آپس میں سچا پیار نہ ہو، ایک دوسرے کے جسم یاں گوشت پوست کے جسم کے لیے کشش نہ ہو، پیاس نہ ہو تو پتی پتنی کا سمبھوگ بھی گناہ ہو سکتا ہے، زنا ٹھہر سکتا ہے جب اس بات کا احساس مجھے ہوا تو میرا من کرچی کرچی ہو کر رہ گیا۔

میں سچ کہوں۔ تمہارے دل میں جو خوف کا احساس سمایا ہوا تھا اس کا بیج تمہارے اس عقیدے میں پوشیدہ تھا کہ بھوگ ایک زہر ہے اور استری بھوگ سب سے تباہ کن ہے۔ کبھی کبھار میرے من میں وچار پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں عورت پن کی جتنی توہین کی گئی ہے اتنی دنیا کے کسی ملک میں نہ ہوتی ہوگی۔ کوئی تمام عورتوں کو ماتا سمان ماننے کا اپدیش کرے گا تو کوئی ہر عورت کو فاحشہ تصور کرے گا تم چونکہ سجن تھے، نرم دل تھے، جذباتی تھے۔ اس لیے میرے بشمول تمام عورتوں کو ماتا سمان سمجھنا

چاہتے تھے۔ لیکن اس کوشش میں تم میرے عورت پن کی توہین کر رہے تھے، اس کا خیال تم نے کبھی کیا تھا؟ میں پوچھتی ہوں ایسا کیوں سوچا جاتا ہے؟ مجھے کوئی بتائے کہ جائز سمبھوگ میں کون سی ناپاکی ہے۔ جہاں بلاتکار نہیں خود سپردگی ہے، فریب کے بجائے آپسی سمجھوتا ہے جہاں صرف کشش نہیں بلکہ پریم کی آتم لوپ کر دینے والی شدت ہو وہاں سمبھوگ کو نفرت انگیز کیوں سمجھا جائے گناہ کیوں ٹھہرایا جائے؟ عورتوں کے پستان ہوتے ہیں، کولہے ہوتے ہیں، ان میں گربھ دھارن کرنے کی شکتی ہوتی ہے۔ —— یہ سب ان کا اپرادھ ہے کیا؟ مرد کے دل میں عورت کے لیے جو فطری خواہش ہوتی ہے اسے گناہ کیوں قرار دیا جائے؟ احتیاط میری سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ بیخ کنی میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ ایک مرتبہ میں نے غاروں میں مسخ شدہ حسین مورتیاں دیکھیں تو مجھے خیال آیا کہ تمام شکستہ مورتیاں بت شکن مسلمانوں نے ہرگز نہ توڑی ہوں گی۔ اس توڑ پھوڑ میں نسوانی جسم اور نسوانی حسن کا خوف دل میں رکھنے والے تم جیسے لوگوں کا ہاتھ بھی ضرور ہے۔ جب عورت ایک جال ٹھہری تو اس کی کشش کے بندھنوں کو توڑے بغیر مرد کے فریضۂ عمل کا راستہ کھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ لیکن عورتوں کے موہ جال میں مرد پھنس جاتا ہے، اس بات کا کیا مطلب ہوا؟ وہ گھر بساتا ہے، بال بچوں کے ساتھ محبت سے پیش آتا ہے، اپنی زندگی کا کچھ حصّہ خاندان کی پرورش پر خرچ کرتا ہے —— بس یا اور کچھ؟ افسوس تم جیسے نیک مرد جو غیروں کے ساتھ اپنائیت کا برتاؤ کرتے اور اپنوں کو غیر سمجھتے ہیں، اتنا سا ایثار کرنے سے قاصر ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آسکا تمہارا یہ طرزِ عمل آج تک نہیں سمجھ سکی ہوں اور اسی لیے شکوہ کرنے پر مجبور تھی۔

لیکن اب سارے شکوے گلے بھی ختم ہو چکے۔ دن بھی ڈوب رہا ہے۔ تمہاری چتا پر راکھ جم رہی ہے اور تمہاری خاطر جمع ہونے والے دوست احباب آہستہ آہستہ اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ شام کے سائے گہرے اور لمبے ہوتے جا رہے ہیں۔ صبح سے گھبرایا ہوا اور تھکا ماندہ شری میری گود میں سو رہا ہے۔ جلد ہی وقت گزر جانے پر اور نئی مہمات کی تکمیل کی جدوجہد میں تمہاری یاد سب کے ذہن سے محو ہو جائے گی۔ دوست احباب بھی تمہیں بھلا دیں گے —— صرف اکیلی میں تمہیں نہ بھلا سکوں گی —— کیوں کہ تم میرے ساتھی نہ تھے، نیتا نہ تھے —— میرا سب کچھ تھے۔

وسنت دیشمکھ

چتر گندھا

سورج کی سنہری کرنیں اس کے بکھرے ہوئے سیاہ اور چمکیلے بالوں پر سستا رہی تھیں۔ موسلا دھار بارش کے بعد پیدا ہونے والی کیچڑ میں چوپایوں کے پیروں کے ابھرے ہوئے نشانات کی طرح اس کے بائیں ہاتھ میں تھامی ہوئی پیلیٹ پر مختلف رنگوں کے دھبے نظر آرہے تھے ہلکی جامنی مائل نیلی ساری اس پر بہت سج رہی تھی۔ وہ بے حس وحرکت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تاثرات کو وہ بڑی تیزی سے اپنی پینٹنگ میں سمونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اصلی روپ زیادہ حسین ہے یا تصویر؟ کہنا مشکل تھا۔

بادامی آنکھوں کی اداسی کامیابی سے تصویر میں منتقل ہو چکی تھی ان آنکھوں کی ہلکی ہلکی لالی بھی بہت خوبصورتی سے ابھر آئی تھی۔ ایک کبوتری کی طرح وہ خاموشی بیٹھی ہوئی تھی۔ تصویر میں بھی یہ سکوت اور خاموشی راہ پاچکی تھی۔

نیلے اور جامنی رنگوں کا وہ دیوانہ تھا۔ اسے خود اس پر بارہا حیرت ہو چکی تھی۔ درحقیقت مصور کو رنگوں کے باب میں چھوا چھوت سے پرہیز کرنا چاہیے یہ بات اسے تسلیم تھی لیکن اس کا برش بالکل غیر محسوس طور پر انھیں دو رنگوں کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا کرتا تھا۔

اسے ان دو رنگوں سے اتنا غیر معمولی لگاؤ کیوں ہے؟ اس کی ساری کے رنگوں سے مماثلت رکھنے والے رنگوں کو برش کے ذریعے تصویر میں بھرتے ہوئے وہ بے خود سا ہو گیا۔ خیالات میں کھوسا گیا۔

وہ صرف بارہ سال کا تھا کہ اس کی ماں اس دنیا سے چل بسی۔ اس کی ساری کا رنگ بھی نیلا ہی تو تھا اور گھر کے سامنے آنگن میں ایک جامن کا پیڑ تھا جس کے جامن وہ پیٹ بھر کے کھایا کرتا تھا اور پھر چھپ کر آئینے میں اپنی جامنی زبان باہر نکال کر تکا کرتا تھا۔ جب وہ سولہ سال کا ہوا تو پڑوس کی رتنی نے ایک مرتبہ

چوری چھپے اس کے ہاتھوں میں ایک پھول تھما دیا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ گئے۔ اس کا بڑھتا ہوا ادھ کچرا جسم سر سے پیر تک تھر تھرا گیا۔ وہ پھول کونسا تھا؟ نیلے رنگ کا کرشن پھول۔

اس کے گاؤں بھی کا آسمان بھی نیلا ہی تو تھا۔ بمبئی کی طرح پھیکا اور خاکستری نہیں بلکہ گہرا نیلا، زمیں پر سبزے کا فرش بچھا ہوا۔ لال مٹی کے سرخ راستے اور چرچوں کی پھیکی جامنی اور نیلی دیواریں۔

وہ چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی بے حس و حرکت۔ کتنی باتونی اور کتنی ناقابل فہم ہیں یہ آنکھیں۔ پہلے یہ اس کی شاگرد تھی۔ اب بیوی ہے۔ لیکن اسے اس وقت کس چیز کی آرزو ہے۔ وہ درحقیقت کیا چاہتی ہے اس کا جان لینا کتنا مشکل تھا وہ اندازہ تک لگانے سے قاصر ہے۔

اب اس کی زندگی میں ایک سکون سا آچلا تھا۔ کام کی تلاش میں بھٹکنے کے دن گذر چکے تھے اب کام اسے گھر بیٹھے ملا کرتا تھا۔ لوگ اپنی لمبی لمبی کاروں میں اس کا پتا پوچھتے پوچھتے اس تک پہنچ جایا کرتے تھے اچھی خاصی رقم ادا کر کے پورٹریٹ کا آرڈر دیتے۔ وہ بھی جو منہ میں آتا مانگ بیٹھتا۔ وہ لوگ ذرا سی بھی بحث کیے بنیر اس کی بات مان لیتے اور ان کا کام ہاتھ میں لینے پر بڑی تشکر آمیز نظروں سے اسے دیکھا کرتے تھے۔

اپنے گاؤں کی مہالکشمی کی یاترا کے موقع پر نکلنے والے رتھ کو سجانے کے سلسلے میں وہ کتنی مدد کیا کرتا تھا رات بھر جاگتا رہتا۔ لیکن وہ سب خلوص کے کارن تھا۔ دیوی سے زیادہ فن سے خلوص تھا اسے۔ اب یہ جو دولت کی گنگا اس کے دروازے پر بہہ رہی ہے یہ مہالکشمی کی مہربانی ہے یا شانتا درگا کا کرم؟۔

اسے شانتا درگا کا مدور اور مسرور چہرہ بہت پسند تھا۔ اس کے دل میں ایک خواہش جاگ اٹھی کہ دیوی جامنی رنگ کی زرتار ساری پہن لے تو کتنا اچھا ہو۔ اس کی یہ خواہش اگرچہ بے معنی تھی لیکن وہ اپنے دل کو کہاں لے جاتا۔

بمبئی کا کنارہ چھوڑتے ہوئے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔ گاؤں کے سندر رتھ کو چھو کر اس نے رخصت لی تھی۔ محبت سے چھونے پر بھی جن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ایسے بمبئی واسیوں کے درمیان اب وہ اپنی زندگی گذارنے جا رہا تھا۔

شروع شروع میں لیٹرنگ کا کام بھی مشکل سے ملتا تھا۔ لیکن ہاتھ کی صفائی اور مہارت کی وجہ سے جلد ہی کامیابی قدم چومنے لگی۔ چھوٹی چھوٹی تصویریں بھی بنانے لگا۔ آمدنی بڑھتی گئی۔ کیلنڈر کے لیے تصویریں بنانے لگا۔ اور یہیں سے ایک نئی زندگی کی ابتدا ہوئی۔ گھر بیٹھے اسے ایک ٹیوشن مل گیا

ایک نازک اور دل چسپ ٹیوشن ۔ درحقیقت اسے ٹیوشن کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی لیکن اپنی ہونے والی شاگرد پر نظر پڑتے ہی رنگ بدل گیا۔

"چتر گندھا" کتنا حسین اور بے مثال نام تھا۔ نام کے ساتھ سجنے والی دلکشی اور خوبصورتی۔ مدھر آواز کے ساتھ ہی ساتھ مصوری سے انتہائی لگاؤ اور رقص کا شوق بھی۔

ٹیوشن دل لگا کر دیا جانے لگا۔ رنگ ملانے وقت گڑبڑ ہونے لگی۔ غیر متعلق رنگ بے تکی جگہوں پر ابھرنے لگے اور ایک نیلی جامنی شام کے دلکش مہورت پر "چتر گندھا" صحیح معنوں میں خوشبوؤں سے بھر گئی۔ سارے رنگ ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔

اس کی قلب ماہیت ہو گئی تھی۔ پچی سے چند سال بیشتر جب وہ یہاں آیا تھا تو بہت ہی دبلا پتلا تھا۔ کھیتوں میں کھڑے کیے ہوئے لکڑی کے بجوکے کی طرح لیکن اب کافی گدرا گیا تھا۔ پکے پھلوں کی طرح۔ سب کچھ بدل چکا تھا لیکن دو چیزیں نہیں بدلی تھیں۔ اس کی آواز جو ویسی ہی پُر خلوص اور فنکار کی سی تھی اور دوسری چیز اس کی انگلیوں کی صفائی۔ اب انگلیاں کچھ موٹی ہو چلی تھیں۔ اچھی غذا ملنے کی وجہ سے ہتھیلی میں سرخی آچلی تھی۔ سگار پکڑے رہنے کی وجہ سے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں میں پیلاہٹ آ چکی تھی بن بلائے مہمان کی طرح۔ انھیں میں سے ایک میں ہیروں کی انگوٹھی جگمگایا کرتی جس پر وہ شاذ ہی نظر ڈالتا تھا۔ اسے تو کینوس پر بکھرے ہوئے رنگوں کو دیکھ کر ہی اطمینان ہوا کرتا تھا۔

وہ بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اُس کا برش اُس کی شخصیت کو صفحۂ قرطاس پر اتارنے میں مشغول تھا۔ سورج کی سنہری کرنیں اب اس کی زلفوں پر بڑے پیار سے ٹھہری ہوئی تھیں۔

فن کاروں کو۔ سچے فنکاروں کو ایک زبردست نفسیاتی و جذباتی صدمہ پہنچانے میں فطرت کو خصوصی مسرت ہوتی ہوگی۔ اس کا پورٹریٹ بے مثال بن گیا تھا۔ اسے اس نے ہال کے درمیان میں ایک نمایاں جگہ پر لگا دیا۔ فریم بھی بڑی حسین تھی۔ سارا ہال حسین لگنے لگا۔ لیکن ہفتے عشرے بعد اس کی بیوی معمولی سے بخار میں مبتلا ہو کر اچانک اسے سسکتا چھوڑ کر چل دی۔ مرتے وقت اس نے بھی نیلی جامنی ساری پہن رکھی تھی۔

اُف اس نیلے جامنی رنگ نے تو اس کا پیچھا نہ چھوڑنے کی قسم کھا رکھی ہے پہلے ماں اور اب

چتر گندھا۔ اسی رنگ کی ساری میں دنیا سے چل بسی اور یہی منحوس رنگ اسے پسند ہے۔ ہائے افسوس۔

دن تیزی سے گذرتے گئے مکان کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی جیسے سنسان ہوگیا تھا۔

گھنٹوں وہ چتر گندھا کی تصویر کو ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتا تھا۔ یہ کرشن پھول بھگوان نے بے وقت کیوں توڑ لیا؟ شانتا درگا ناراض تو نہیں ہوگئی ما؟ میری زندگی کا رتھ اس طرح چکنا چور کیوں ہوگیا؟

اب آمدنی میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا تھا۔ دولت سے نفرت کریں تو لکشمی ہات دھوکر پیچھے تو نہیں نا پڑجاتی؟ اتنی ساری دولت کا وہ کیا کرے گا؟ کام کے ساتھ ساتھ اس کے دکھوں میں بھی اضافہ ہوگیا تھا اپنے دیہات کے مندر کے آنگن میں جیون بتایا کرتا تو؟ دن گذرتے گئے خیالات کی بھیڑ بڑھتی گئی اور ساتھ ہی ساتھ پُر فریب اور خوبصورت دوشیزاؤں کی بھی ــــ ایک دولت مند مصوّر۔ ایک عظیم فنکار باذوق خوب صورت اور اکیلا اور کیا چاہیے انھیں۔

اس کی گردن میں نت نئے ہاتھوں کے ہار پڑنے لگے۔ کچھ مرجھائے سے۔ کچھ گڑیوں جیسے۔ کچھ پسیجے ہوئے۔ کچھ بالوں بھرے اور کچھ جلا دینے والے۔ آواز مدھر ہے تو حسن معدوم۔ حسن دلفریب تو آواز پھٹے بانس جیسی، بعضوں کا چمٹ جانے والا انداز کراہیت پیدا کر دیتا تھا۔ چھی۔ چتر گندھا کی جوتی کے برابر بھی ان میں سے کوئی نہیں تھی۔

کبھی کبھی وہ صرف حصولِ مسرت کے لیے پینٹنگ کرتا ہوا گھنٹوں بیٹھا رہتا جنگل کا منظر! سنہری دھوپ درخت کی شاخوں سے چھنتی ہوئی گھاس پھوس کی جھونپڑی پر پڑ رہی ہے۔ اس نے کچھ دور سے اپنی اس تصویر پر نظر ڈالی۔ اسے خود تعجب سا ہوا۔ یہ کیا رنگوں کے سلسلے میں اس کے اندر کافی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ ہری ڈالیوں کو بھی اس نے سیاہ اور چتکبری بنا ڈالا تھا۔ دھوپ کی لکیروں میں اڑتے ہوئے دو کالے کوّے بنا کر اس نے سیاہ رنگ کو خواہ مخواہ اہمیت دی تھی۔ جھونپڑی کے باہر چرتی بھینسیں بھی گہری سیاہ تھیں۔ اسی طرح جھونپڑی سے ٹکے ہوئے بیل گاڑی کے شکستہ پہیے پر لگی ہوئی رنگ بھی اس ضرورت سے زیادہ سیاہ بنا ڈالی ہے۔ ہات تیری کی اُس ہائی لائٹ سے سیاہی بہت واضح طور پر چھائی ہوئی نظر آرہی ہے اس تصویر پر ایک عجیب وغریب اداسی، دکھ اور تنہائی کی چھاپ نظر آتی ہے۔ جھونپڑی کے اندر سے آہستہ آہستہ نکلنے والا دھواں۔ ارے باپ رے۔ اس نے نیلا جامنی بنا ڈالا ہے۔

وہ اپنی تنہائی سے اکتاہٹ سی محسوس کرنے لگا تھا۔ عورت کے بغیر ہر چیز شمشان گھاٹ لگ

رہی تھی۔ چترگندھا تو نہیں، لیکن ایک روپ گندھا اسے مل ہی گئی۔

دن بڑی تیزی سے گذرنے لگے۔ تفریحاً پینٹنگ کرتے ہوئے اس کا ہاتھ بہکنے لگا۔ وہ پہلی سی بات نہ رہی۔ رنگوں کا ملاپ بگڑنے لگا۔ مایوسی کے ساتھ برش پٹکتے ہوئے وہ آنکھیں بند کیے ہوئے گھنٹوں پڑا رہتا۔

ایک رات وہ اس کے سپنے میں آئی۔ نیلی جامنی ساری میں لپٹی ہوئی چترگندھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں برش لیا اور بڑی تیزی سے سارا جنگل سبزہ زار میں بدل دیا۔ دھوپ کی کرنوں کو سنہری بنا ڈالا۔ کووں کو بگلوں میں تبدیل کر دیا اور گاڑی کے شکستہ پہیے کو سرے سے مٹا ڈالا۔ صبح کو وہ اٹھتے ہی کام میں جٹ گیا۔ چترگندھا کے بھرے ہوئے رنگ اس کے ذہن میں محفوظ تھے۔ اس کا ہات تیزی سے حرکت کرنے لگا۔ پہلی سی صفائی کے ساتھ۔ خزاں کا دور ختم ہو چکا تھا اور بہار کے پھول کھل رہے تھے۔

اب یہ روز کا معمول ہو گیا کہ وہ دن میں کوئی تصویر شروع کرتا اور وہ رات کو خواب میں آکر برش کے ہاتھ مار کر اسے مصوری کے نئے آداب سکھاتی۔ اس درمیان اس کی نئی محبت کا رنگ بھی گہرا ہوتا چلا گیا۔ چندرلیکھا اسے چھوڑنے پر تیار نہ تھی۔ وہ شادی پر تیار نہ تھا وہ صرف اس کی صحبت چاہتا تھا لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ اس ناگن نے اسے اچھی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

آخر وہی ہوا جو متوقع تھا۔ ایک نیلی جامنی شام کے دلفریب مہورت پر چندرلیکھا کلی سے پھول بن گئی۔ وہ دونوں جب مکان میں داخل ہوئے تو آدھی رات کا چاند اس چہرے سے انھیں تک رہا تھا۔ تمام لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ چندرلیکھا نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ بھی آرام کرنے لگا۔ پھر بہ جائے اس کے کہ وہ چندرلیکھا کو اپنی طرف کھینچتا خود اس نے اسے اپنے قریب کر لیا۔ ڈرتے ڈرتے اس نے چترگندھا کے پورٹریٹ کی اور دیکھا۔ اس کی نگاہیں غصے، رنج اور رشک وحسد کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

دیویوں کی آنکھیں مند گئیں۔ تھکی تھکی سانسیں لینے والی چاند کی کرنیں گھر میں در آئیں۔ "وہ ...... وہ کہیں آج سپنوں میں آگئی تو" وہ کانپ سا گیا۔ ساری رات محبت کے راز و نیاز میں گذر گئی۔ چترگندھا سپنوں میں نہ آسکی۔ اسے یک گونہ سکون سا محسوس ہوا۔ صبح کو چائے پیتے ہوئے اس نے چترگندھا کے پورٹریٹ کی طرف دیکھا۔ وہ اسے آج بدلی ہوئی سی نظر آئی۔ نوچی کھسوٹی ہوئی سی۔

وہ اٹھا اسٹول پر چڑھا۔ اس نے پورٹریٹ کے پیچھے جھانک کر دیکھا۔ جھینگروں کی ایک فوج پورٹریٹ میں سوراخ بنانے میں بری طرح مصروف تھی۔

مدھو منگیش کرنک

پڑاو

گول دیوی کی چراگاہ میں آج سویرے بنجاروں کے ڈیرا جمانے کی خبر اَنّا فوجدار کے کانوں تک دوپہر کو پہنچی اور گورا چٹا قوی ہیکل اَنّا فوجدار غصّے سے لال پیلا ہوگیا۔ اطلاع دینے والے بھیک ناک مہار کو اس نے ڈانٹتے ہوئے پوچھا "سچ بتا آج صبح ہی کو وہاں آپڑے ہیں نادہ خانہ بدوش؟"

"ہاں فوّدار صاب! آج سُبا ہی کو ــــ میں نے جنگل سے لوٹتے سمے دیکھا انھیں۔ اب تک پڑاو ڈال کر عورتیں بھیک منگنے باہر نکل چکی ہیں۔"

"اور مرد کیا کر رہے ہیں؟"

"وہ تو نالے پر بیٹھے گڈی (تاش) کھیل رئے ہیں۔"

"تب تو وہ لوگ گورکھ ناتھی نہیں ہو سکتے۔"

"ہاں کان پھٹے نہیں ہیں وہ ــــ بہوت کرکے بلوچی ہوں گے۔"

"کیسے کہہ سکتا ہے تُو؟"

"عورتیں گھگرا پہنے ہیں اور سر پہ رومال لپیٹ رکھا ہے۔"

"تب تو سالے بلوچی ہی ہیں ــــ بہت حرامزادے ہوتے ہیں۔ سرکاری قانون کو تو خاطر میں نہیں لاتے۔" بیٹھے بیٹھے اَنّا غرایا اور سروتے میں پکڑی ہوئی چھالیا کے کھٹاک سے دو ٹکڑے کر ڈالے۔

"ترنت وردی (رپورٹ) نہیں دینے تو شام کو وہ نہیں رہ سکتے یہاں۔ کانون کے متابک فوّدار صاب کو وردی دینی پڑے گی انھیں۔ جائیں گے کہاں رنڈی کی اولاد۔" بھیک ناک بولا۔

"ابے کیا شام تک انتظار کروں؟ تو بھی ایک ہی احمق ہے۔ سرکاری چاکر ہے نہ تو؟ سالانہ چھتیس روپیا

محنتانہ لیتا ہے اور ان کی وردی آنے تک انتظار کرنے کے لیے کہتا ہے؟ پھر تیرا فایدہ کیا ہے، ابھی جا اور ان کے اگوے کو بلاکر لے آ یہاں ــــ کہنا فوجدار کی کچہری میں رپورٹ دیے بغیر یہاں پڑاو نہیں ڈالا جاسکتا ــــ سالے مجرموں کی ٹولی ہوتا ہے ان کا قبیلہ۔"

اَنّا فوجدار بڑبڑاتا رہا ــــ بھیک ناک مہار کمر سے بندھی درانتی کو سنبھالتے ہوئے گول دیوی کے میدان کی طرف نکل گیا ــــ اَنّا کو کچہری میں انتظار کرتا چھوڑ کر۔

بلوچیوں کا گروہ بہت بدمعاش ہوتا ہے۔ فصل کے موقع پر آنے والے دوسرے گروہ گورکھ ناتھ، نٹ، بندر والے، جادوگر اور کھیل تماشے والے یہ سب گانو میں داخل ہوتے ہی فوجدار کی بنگلیا تک پہنچ کر اپنے داخلے کی رپورٹ دیتے۔ ڈیرے کی عورتوں، بچوں، مردوں، کتوں، مرغیوں، گدھوں گھوڑوں غرضکہ ہر چیز کی فہرست پیش کرتے تھے۔ اَنّا فوجدار تمام باتیں تفصیل سے درج کرنے کے بعد پڑاو کی جگہ تجویز کرتا تھا۔ نٹوں کا گروہ چار دن، گورکھ ناتھ ایک دو روز اور مختلف کھیل تماشے دکھا کر تفریح مہیا کرنے والا ٹانڈا ہفتہ بھر رُکنے کی اجازت حاصل کرلیتا۔ لیکن سب سے بُری جماعت بلوچیوں کی جب تک ان کا گروہ پڑاو ڈالے رہتا گانو پر خوف وہراس کی فضا طاری رہتی۔ اَنّا فوجدار اس قبیلے کے ساتھ کوئی رو رعایت روا نہ رکھتا تھا اور آج تو وہ غصے سے کھول رہا تھا۔ خانہ بدوشوں کو گانو میں داخل ہوتے ہی فوجدار کچہری میں حاضر ہونا چاہیے لیکن بلوچیوں نے اس قاعدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پڑاو ڈال لیا تھا اور اس واقعے کو کئی گھنٹے گذر چکنے کے بعد بھی انھوں نے باقاعدہ رپورٹ نہیں کرائی تھی اس اندھیر اور لاقانونیت کی کوئی حد بھی ہے؟

"ٹھہر جاؤ حرامزادو! آج رات نہیں اس گانو میں چولھا جلانے نہیں دوں گا۔ کیا سمجھ رکھا ہے؟ میں اَنّا فوجدار ہوں ــــ برہمن کی اولاد ہوں اصلی۔"

دوپہر کی دھوپ آئینے کی طرح چمک رہی تھی۔ دُور لال بگولہ نیلے آسمان کی طرف ہمک رہا تھا اور کسی خشک پیڑ پر کھٹ بڑھئی ٹک ٹک کر رہا تھا۔ باقی سارے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اَنّا کی بیوی دیوان خانے میں آکر چوکھٹ پر کھڑی ہوگئی، چوڑیوں کی کھنکھناہٹ سن کر اَنّا نے گدے پر بیٹھے بیٹھے پیچھے مڑ کر دیکھا جنیو میں بندھے دھات کے خلال کو انگلیوں میں تھام لیا۔

"خاصی دھوپ چڑھ آئی ــــ کیا آج اشنان کا ارادہ نہیں ہے؟"

اناگی بیوی کیلے کی کونپل جیسی نرم و نازک لگ رہی تھی۔ اس کی آواز بھی چینی کے برتنوں کی کھنکھناہٹ سے مشابہ تھی۔ اب تک وہ اولاد سے محروم تھی۔ انا نے خلال شروع کر دیا۔ آنکھیں بھیک ناک کی واپسی کے راستے پر مرکوز کیں اور رگرجدار آواز میں بولا" ذرا کچہری کا کام پورا ہو جانے دو! نہالوں گا۔ کوئی ایسی دیر تھوڑی ہوئی ہے۔ بال بچے تھوڑی ہیں جو بھوکے ہوں میرے انتظار میں۔"

اناگی بیوی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آگے بڑھی اور انا کے سامنے سے گذرتی ہوئی آنگن میں چلی گئی دھوپ میں سوکھتی پڑی ہوئی کوئی چیز اٹھاکر واپس لوٹ آئی۔ خلال کرتے ہوئے انا اس کی حرکات کا جائزہ لیتا رہا۔ ہری ساری میں اس کا گورا بدن کھلا پڑ رہا تھا۔ پتلی سی گردن اور کلسی کے برابر جوڑا تھا۔ پیروں میں جوتیاں بازو پر کرناٹکی بازو بند۔ آم کی کچی گٹھلی جیسی ٹھوڑی ـــ انا نے سوچا۔

" جلدی سے اشنان کر لینا چاہیے۔ بیوی کو خواہ مخواہ انتظار کرانا ٹھیک نہیں۔"

اتنے میں بھیک ناک لوٹ آیا۔ آنگن میں کھڑے ہو کر اس نے گھنگرو لگی انی دار لاٹھی ہلائی اور فوجدار کو سلام کیا۔

" کیا کہتے ہیں بلوچی ؟ "

" ڈیرے پر تو کوئی نہیں ہے۔ صرف ایک بڑھیا بیٹھی ہے اس کی بھاشا میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

" سارے مرد کہاں چلے گئے ؟ "

" نہیں مالوم۔"

" اور عورتیں ؟ "

" ڈیرے پر تو کوئی نہیں ہے۔"

انا نے دانتوں تلے ہونٹ دبالیا۔ خلال دوبارہ جنیو میں باندھا۔ کمر سے نیچے انگلیاں پھرا کر دھوتی ٹھیک ٹھاک کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کھونٹی پر سے کوٹ اتار کر پہنا ہیٹ سر پر جمائی۔ پیتل کے بھاری بھر کم بکل سے مزین چمڑے کا موٹا کالا پٹا کمر سے باندھا اور کر کراتے ہوئے جوتے پہن کر بھیک ناک سے بولا" چل رے۔"

" اب کہاں صاب ؟ "

" حرام خوروں کو ڈھونڈ نکالیں گے اور خبر لیں گے اپنی من مانی کرتے ہیں سالے۔"

"چلیے صاب:"

انّا کے قدم باہر پڑنے سے پہلے ہی دروازے کے پیچھے سے نازک سی آواز ابھری: اب کھانا کھا کر ہی جائیے چلچلاتی دھوپ ہے۔ اشنان ابھی ہوا جاتا ہے اور کھانا تو بالکل ......"

"اب باہر نکلا سو نکلا۔ سرکاری کام پہلے اس کے بعد کھانا پینا۔ ابھی لوٹ آتا ہوں:"

آگے آگے فوجدار اور اس کے پیچھے بھیک ناک مہار۔ دونوں دوپہر کی دھوپ میں گول دیوی کے میدان کی طرف نکل گئے۔

"سالے جائیں گے کہاں:" بھیک ناک اپنے آپ سے بولا۔

"ارے ان کی بات نہ کر۔ چاقو چھریاں بیچنے پھر رہے ہوں گے سارے گانو میں۔ وہی چھرا تجھے یا مجھے دکھا کر دھمکانے کی کوشش بھی کر سکتے ہیں سالے:"

"آپ کے ہاتھ میں چھڑی ......"

"چھڑی وڑی کی کیا ضرورت ہے۔ مجھ سے لگ چلیں گے تو تھپڑوں سے ادھ موا کر دوں گا:" انّا نے اپنے مضبوط ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔

خالی پگڈنڈی پر چار چیلیں کرکراتی ہوئی آگے بڑھنے لگیں پڑاو نظر آنے لگا۔ چلچلاتی دھوپ میں جیسے تیسے تنبو تان دیے گئے تھے۔ آس پاس کوئی متنفس نظر نہیں آتا تھا پڑاو پر خاموشی چھائی ہوئی تھی دونوں وہاں پہنچ کر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگے سامنے کے تنبو میں ایک بوڑھی بلوچن بیٹھی نظر آئی جس کے پیچھے ایک شطرنجی کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ بڑھیا اس طرح جمی بیٹھی تھی جیسے پہرا دے رہی ہو۔ اس کے بال مہندی سے رنگے ہوئے تھے اور بھویں تک سُرخ تھیں۔

دونوں کی آہٹ پاتے ہی بڑھیا بیٹھے بیٹھے چلائی: "وہیں کھڑے رہو! آگے مت آنا"

"میرے آنے پر بھی یہ رنڈی ایسے ہی چلائی تھی۔ میرے کو آگے نہیں بڑھنے دیا" بھیک ناک بولا۔ انّا فوجدار تھم تو گیا لیکن اس کی تیز نظریں چاروں طرف پڑ رہی تھیں۔ پڑاو خالی خالی سا کیوں ہے؟ سارے لوگ کہاں غائب ہو گئے۔ عورتیں تک نظر نہیں آ رہی ہیں۔ یہ بڑھیا اس طرح جمی کیوں بیٹھی ہے؟ اور یہ پردہ کس لیے؟

اسی وقت پردے کے پیچھے کچھ ہلچل سی مچ گئی۔ شطرنجی کے پیچھے سے تین چار گھنگھرے والی لمبی

ترنگی عورتیں نمودار ہوئیں۔ ان کے گھگروں میں ٹکی آرسیاں دھوپ میں جل اٹھیں اور بجھ گئیں۔ وہ عورتیں تیز تیز بولتے ہوئے بڑھیا کے ارد گرد بیٹھ گئیں اور اپنی ناقابل فہم زبان میں اسے کچھ بتانے لگیں۔ سنتے ہوئے بڑھیا کا چہرہ دمک اٹھا۔

انّا فوجدار اور بھیک ناک مہار پڑاو کے باہر دھوپ میں کھڑے تھے۔ بھیک ناک نے اپنی لاٹھی زمین پر ٹکا دی تھی اور اس پر دونوں ہاتھ ٹیک کے ان پر ٹھوڑی جمائے کسی چرواہے کی طرح کھڑا تھا۔ انّا مسلسل ان چُنچُناتی ہوئی عورتوں کو تکے جا رہا تھا۔ اچانک عورتوں کی توجہ ادھر ہوئی وہ دھوپ میں آنکھیں مچکاتی ہوئی اس کی طرف بڑھیں اور دریافت کرنے لگیں "کیا بات ہے"۔

"ہم فوجدار ہے اس گانو کا! تمہارے مرد لوگ کدھر ہیں؟ ہم کو تم لوگوں نے وردی (رپورٹ) نہیں دیا اب تک ....؟" انّا اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں گرجا۔

عورتوں کی سمجھ میں معاملہ آگیا۔ وہ آپس میں کچھ پھسپھسائیں۔ پھر ان میں سے ایک پڑاو سے باہر نکل کر دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر زور سے کسی کو پکارنے لگی۔ سامنے کی ٹیکری سے ٹکرا کر آواز کی باز گشت فضا میں گونجی۔ فوراً ہی دور دھوپ میں سات آٹھ سفید و سرخ دھبے نظر آنے لگے۔ پانچ سات منٹ میں چوڑی دار پائجامے پہنے ہوئے بلوچی مرد پڑاو پر آپہنچے۔ وہ آتے ہی پہلے سامنے والے تنبو میں گھس پڑے۔ شتر نجی کے پیچھے گڑ بڑ چل رہی تھی۔ بڑھیا ہنستے ہوئے ان سے کچھ کہہ رہی تھی۔ مرد کافی خوش نظر آنے لگے۔ پھر بڑھیا ان کے ہاتھوں پر کوئی کھانے کی چیز رکھتی چلی گئی وہ منہ میٹھا کرانے کے انداز میں اصرار کر کر کے ایک دوسرے کو کھلانے لگے۔ آپس میں زور زور سے باتیں کرنے لگے۔ انّا فوجدار اور اس کے اردلی مہار کی طرف کسی کی توجہ نہ تھی۔

اچانک ایک گھگرے والی نے اپنے شوہر کو متوجہ کر کے دو "غیر" مردوں کی طرف انگلی اٹھائی وہ بھاری بھرکم بلوچی جبڑے چلاتا ہوا انّا کے پاس آیا۔ اس کے پیچھے دوسرے مرد بھی آپہنچے۔ انّا تب تک غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ ان بدمعاشوں کی خبر لینے کے لیے اسے الفاظ نہیں سوجھ رہے تھے۔ سوچ رہا تھا انھیں راتوں رات نکل جانے کا حکم دے دوں۔ لیکن انّا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس لمبے تڑنگے بلوچی نے جھک کر بڑی انکساری سے انّا کو سلام کیا اور بولا "معاف کرنا مالک، ہم مجبور تھے۔ قانون ہم جانتے ہیں لیکن آج ایسا بُرا ٹائم تھا کہ گاؤں میں آنے کے بعد آپ کو وردی

دینے کا بھی موقع نہیں مل سکا۔ ہمارے ساتھ ایک بچہ پیدا ہونے والی عورت تھی ۔ ابھی ابھی اسے چھٹکارا ملا ہے۔ خدا کی قسم مالک ..... "

اناّ سنتا رہا اور اس سے سوا یا ڈیڑھ گنا اونچا سرخ و سفید بلوچی بڑی عاجزی کے ساتھ اپنی رام کہانی سناتا رہا۔ پڑاو ڈالتے ہی درد شروع ہونے سے دوسری عورتیں اس حاملہ عورت کی دیکھ بھال میں مصروف ہوگئیں۔ مرد پڑاو سے کچھ دور ہو گئے اور فکر مندی میں "وردی" دینا بھول گئے۔ وہ لاچار سے ہو گئے تھے اور اس وقت ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافی مانگ رہے تھے۔ لیکن اناّ کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ سرکاری قانون کو بہر حال ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ پھر بلوچیوں کی فریب کاریاں مشہور زمانہ تھیں اس نے دوبارہ اس شطرنجی کے پردے پر شک آمیز نظر ڈالی۔ اچانک پاس کھڑی ہوئی بڑھیا جھٹکے کے ساتھ اُدھر بڑھی اور اس نے شطرنجی کو ہاتھ بڑھا کر ایک طرف سرکا دیا۔ زمین پر میلے کچیلے لبادے میں لپٹی ہوئی ایک گوری چٹی بلوچن سوئی تھی اس کے پہلو میں ایک نوزائیدہ بچہ پڑا ہوا تھا۔ اناّ کے ذہن میں اپنے گھر میں چلتی پھرتی کیلے کی نازک کونپل گھوم گئی۔ سبز پیرہن۔ گورا رنگ، کرناٹکی بازوبند اور بالاخانے پر پڑا ہوا خالی پالنا جو ڈوریوں سے اب تک محروم رہا تھا ۔۔۔ دوسرے ہی لمحے پردہ اپنی جگہ واپس آگیا۔

بوڑھی بلوچن اناّ کی طرف ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے پوچھ رہی ہو "اب بھی یقین آیا کہ نہیں آپ کو؟"

"ٹھیک ہے" اناّ اپنی نظریں ہٹاتا ہوا بولا "ابھی ہمارے پیچھے آؤ اور پورا وردی بتا کے واپس جاؤ!"

"جی ہاں سرکار!" وہ لمبا تڑنگا بلوچی دوبارہ سلام کرتا ہوا بولا "لیکن اب ہم کو کم سے کم چار چھ دن اس گانو میں رہنا پڑے گا سرکار ۔۔۔ اتنے دنوں کے لیے مہربانی ....."

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے" اناّ نے اپنی مخصوص گرجدار آواز میں کہا۔ اس کا ہاتھ جیب میں گیا۔ ایک روپے کا سکہ اس نے شطرنجی کی طرف اچھال دیا اور گھوم کر گانو کی طرف چل پڑا اتنے میں عقب سے آواز آئی "سرکار!"

اناّ رک گیا۔ وہ بلوچی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کی اور آرہا تھا۔

"یہ لو مالک — منہ میٹھا کر دیا اپنے گھر میں۔" اس نے بادام اور مصری کی ڈلیاں انّا اور بھیک ناک کے ہاتھوں پر رکھ دیں اور دوبارہ سلام کیا۔ انّا کی گھنی مونچھوں سے مسکراہٹ پھوٹی۔ منہ چلاتا ہوا وہ گھر کی سمت مڑ گیا۔ راستے میں ایک بلوچی عورت نظر آئی جو پڑاؤ کی طرف لوٹ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں مرغی دبی ہوئی تھی۔ ان دونوں پر نظر پڑتے ہی اس نے مرغی کی گردن مروڑ کر اسے اپنے گھگرے میں چھپا لیا۔

بھیک ناک جلدی سے بولا "چھنال نے گانو سے مرغی چرالی ہے۔ پوچھوں سالی سے؟"

نہیں نہیں جانے دو! سنا ہے زچہ کے لیے مرغ کا سوپ بڑا مفید ہوتا ہے، کیوں؟"

بھیکا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک مرتبہ گردن موڑ کر پڑاؤ پر نظر ڈالی اور فوجدار کے پیچھے خاموشی سے گردن جھکا کر چلنے لگا۔

ش۔ نا۔ نورے

روٹی کا جادو

گیارہ بج چکے تھے۔ آٹے جیسی سفید دھوپ ہر جگہ پھیلی ہوئی تھی میدان میں کھڑے آم کے پیڑ شاخوں کے ہاتھ پھیلائے، میدان کو اپنے سائے میں لینے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ کونے میں ریٹھے کا درخت پتوں کی سبز چھتری تھامے دھوپ سے اپنا بچاؤ کرنے کی کوشش کر رہا تھا بظاہر لاوارث لیکن ساری باڑی کے گھروں سے اپنا راتب حاصل کرنے والا مریل سا کتا درختوں کے سائے میں سستا رہا تھا۔ وہیں پاس میں ماروتی کا چھوٹا سا مندر تھا۔ جیسے نمائش میں رکھا ہوا ہو مندر کی گھنٹی اتنی نیچی تھی کہ چھوٹے بچے بھی اسے بجا سکتے تھے۔ ناریل پھوڑنے کے لیے کسی نے ایک بھاری پتھر اس مندر کے سامنے لا رکھا تھا جو بچوں کے لیے بیٹھک کا کام دیتا تھا۔ پرسوں ہنومان جینتی کے موقعے پر رنگا یا ہوا ماروتی دوپہر کی چلچلاتی دھوپ کو آنکھیں پھاڑ کر گھور رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی ہی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ قریب میں ریلوے اسٹیشن کے پھاٹک پر ایک اینٹوں بھری لاری کھڑی تھی اور ڈرائیور پھاٹک پر پیر رکھے کلینر کے ساتھ بیٹھا پھاٹک کھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ راستہ سنسان پڑا تھا۔ باڑی کے باکار لوگ روٹی کی تلاش میں کبھی کے روانہ ہو چکے تھے۔ بوڑھے پوجا پاٹ میں لگے ہوئے تھے اور عورتیں گھروں کے اندر کاموں میں مصروف تھیں۔ بچوں کے اسکول میں چھٹیاں تھیں۔ دوپہر کا کھانا جلد ہی کھا کر سب بچے گوپال راو کے میدان میں جمع ہو گئے تھے بڑے بچے مختلف قسم کے کھیلوں میں مصروف تھے۔ بہت سے بچے اپنے اپنے گھروں سے تاش لا کر سائبان تلے بیٹھے کھیل رہے تھے۔ لڑکیاں گول پتھروں کو اچھال اچھال کر "ایکی بیکی" کھیل رہی تھیں۔

چلچلاتی دھوپ میں دو جسم بڑی سڑک چھوڑ کر باڑی کی طرف مڑتے نظر آئے۔ ان کے پیروں میں بدن چراتے سایوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ادھیر مرد کا ہاتھ تھامے ہوئے ایک دبلا پتلا لڑکا چل رہا تھا۔ مرد نے دائیں ہاتھ میں بندوق کی طرح ایک لاٹھی تھام رکھی تھی۔ جس کے آخری سرے پر ایک بانس کا پٹارا لٹک رہا تھا۔ لڑکے کے ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی تھیلی تھی۔ دونوں جھومتے جھامتے چلے آرہے تھے۔ ان کے کپڑے عام انسانوں سے کافی مختلف تھے۔ مرد کے سر پہ پھُندنے والی سُرخ ترکی ٹوپی تھی اور جسم پر گھٹنوں تک لٹکتا ہوا بوسیدہ سبز ریشمی کرتا تھا جس کے نیچے سے لال اور ہری چوکڑیوں والا تہمد جھانک رہا تھا۔ لڑکے کے سر پر بید کی بنی ہوئی تنگ ٹوپی تھی اور ٹخنوں سے نیچا مٹیالا سا پاجامہ۔ کھلے میدان میں پھیلی ہوئی دھوپ پر پڑے ہوئے چھاؤں کے دھبے نے انھیں آواز دی تھی۔ ریٹھے کے درخت نے ان کی آنکھوں کو سبز طراوت پہنچائی تھی۔ اور وہ باڑی کی طرف مڑ گئے تھے، جہاں آس پاس مکانات تھے، چالیاں تھیں۔

ان کو آتا دیکھ کر درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے کتّے نے دم دبا کر راہ فرار اختیار کی۔ تاش کھیلنے والے لڑکوں میں سے ایک نے چونک کر انھیں دیکھا۔

"اے، وہ دیکھ مسلمان!"

"ہاں رے ۔۔ اس کے پاس چھُرا ہوگا کیوں؟"

کھیل درمیان ہی میں رک گیا۔

"سالا مداری ۔۔ جادوگر" مکّو یہ بھول کر کہ داداجان گالی بکنے پر خفا ہوتے ہیں، زور سے چلایا۔ ہاتھوں میں تھامے ہوئے تاش کے پتے زمین پر گر گئے۔ گول سمندری پتھر ہوا میں اچھلنے کے بجائے فرش پر پڑے کے پڑے رہ گئے۔ سارے بچّے درخت کے نیچے مداری کے ارد گرد جمع ہوگئے۔ کوئی منہ میں انگلی دبائے ہوئے تھا، کسی کا ہاتھ اپنی جیب میں تھا۔ کسی کے دونوں ہاتھ کمر پر جمے ہوئے تھے تو کوئی انھیں چھاتی پر لپیٹے ہوئے تھا۔

پھیکی سیٹھی دوپہر میں رنگ بھرنے لگا۔

بچوں نے "جادوگر" کو پان کی پیک اچھالنے دینے کے لیے اپنے دایرے میں ہلکا سا خم پیدا کیا اور پھر سے اپنی اپنی جگہوں پر جم گئے۔ مداری نے ہتھیلی سے ہونٹ صاف کرتے ہوئے

آواز لہرا کر پوچھا۔ "کیوں بچو! اسکول میں چھٹی ہوگئی؟"

"سالی کبھی کی ہوگئی"۔ مکو کے دادا پوجا پاٹ میں لگے ہوئے تھے۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے"۔ مداری ہنسا۔ اپنی پھند نے دار سرخ ٹوپی پٹاری پر پھینکی پھر لڑکے کی ٹوپی اس کے سر سے جھپٹ لی اور اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتا ہوا بولا۔

"اس گدھے کو تو ہر روز چھٹی ہے۔ اسکول ہی نہیں جاتا"۔ بچے اس لڑکے سے حسد کرنے لگے مکو سب سے زیادہ۔ "اسکول وسکول کچھ نہیں۔ گاؤں گاؤں کی سیر۔ روز روز جادو کے کھیل دیکھنا۔ واہ۔ واہ۔ واہ"۔

ادھر جادوگر اس لڑکے کے بالوں کو مٹھی میں تھام کر کھینچتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "گدھے کبھی نہاتا ہے؟ بچو! تمے روج نہاتے نا۔ یہ تو ایک دم بےکار لڑکا ہے"۔

"لو ــــ نہانے سے بھی چھٹکارا"۔ مکو نے دل میں کہا۔

جادوگر نے اپنا پٹارا کھولا۔ بچوں کی نظریں تیزی سے اس کے اندر رینگ گئیں۔ لڑکے نے اپنی تھیلی کا منھ کھولا۔ ایک میلا سا کپڑا نکال کر زمین پر پھیلا دیا۔ پھر ڈگڈگی نکال کر ماتھے سے لگائی۔ مٹی اٹھا کر ماتھے سے چھوائی۔ دونوں کے چہروں سے سنجیدگی برس رہی تھی۔ بچے خاموشی سے ان کے حرکات وسکنات کو دیکھ رہے تھے۔ ان جیسا، ان ہی کی عمر کا ایک لڑکا بزرگوں کا سا انداز اپنائے ہوئے تھا۔

"عبدل۔ سب تیاری کر رکھو۔ میں ذرا بیڑی پی لیتا ہوں"۔

مداری کی بیڑی ختم ہونے تک عبدل نے پھیلے ہوئے کپڑے پر ایک ایک چیز جما کر رکھ دی۔ مردے کی اندھی کھوپڑی، ہڈیاں، رنگین گیند، چوکور ڈبے، لکڑی کی بطخ، تاش کی بوسیدہ سی گڈی، کپڑے کی گڑیا، شیشے کے گلاس، رنگین رومال اور ایک چھوٹی سی بانسری۔ ان چیزوں کو ایک مرتبہ بھی چھونے کا موقع مل جاتا تو بچے اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتے۔

جادوگر نے لکڑی کے ایک سرے سے زمین پر لمبا سا دایرہ بنایا اور منہ سے بنسری بجانے لگا۔ عبدل نے زور سے ڈگڈگی کھڑکائی۔ "باکڑ بم بم بم۔" ایک ہاتھ سے پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو ہٹاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے وہ ڈگڈگی بجاتا رہا۔ جادوگر نے منہ سے

بنسری لگائے رکھی۔ پھر سارے سامان پر نظر ڈال کر بچّوں سے مخاطب ہوا۔" بچہ لوگ تالی بجاؤ۔"

بچّوں نے تالیاں بجائیں۔ عبدل زور سے گرجا" اور جور سے" حکم کی تعمیل ہوئی۔

مداری نے المونیم کی ایک پتیلی کو لنگی سے پونچھ کر عبدل سے پانی لانے کے لیئے کہا۔ زمین پر بیٹھے ہوئے بچّوں کے گھیرے کو پھلانگتا ہوا عبدل پانی لانے کے لیئے چلا گیا۔ جادوگر نے ڈگڈگی اور بنسری ایک ساتھ بجانا شروع کی۔ تماشائیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ پھر تین پتھروں پر لکڑی کا ایک پیالا چڑھا جسے عبدل نے پانی سے لبالب بھر دیا اور لکڑی کی بطخ کو اس میں تیرا دیا۔

ڈم ڈم ڈم" جے کالی کلکتے والی، تیرا وچن نہ جائے خالی"

جادوگر نے عبدل کو پکارا۔" اوے جمورے"

"ہاں"

"نام کیا ہے تیرا؟"

"مست رام۔"

"میں کون ہوں؟"

"نہیں معلوم۔"

"بتاؤں۔"

"ہاں بتاؤ۔"

"ڈر جائے گا۔"

"ڈرے گا تیرا باپ۔"

"میرا باپ کون ہے؟"

"میں ہوں مست رام۔"

"تیری ایسی کی تیسی۔ سالا نوا تنا چھوٹا اور میرا باپ۔"

"ہاں میری عورت ایک دم بڈھی تھی۔"

"توکیا کھاتا ہے ؟"

"گالی۔"

"پیتا کیا ہے ؟"

"خالی دارو پیتا ہوں۔"

"چوپ۔"

عبدل بچوں کی طرف مڑ کر مراٹھی میں بولا۔" دیکھو دیکھو باپ کو سالا' چوپ' کہتا ہے"

باڑی کے بچوں نے ہنسی کا طوفان اٹھا دیا۔ عبدل اسی طرح مذاق کرتا رہا اور جادوگر اس پر بگڑتا رہا۔ وہ جادوگر یقیناً عبدل کا باپ تھا لیکن عبدل کس بے باکی سے اسے گالیاں دے رہا تھا۔ پانی میں بطخ ڈبکیاں لگا رہی تھی۔

پھر جادوگر نے ایک گلاس اٹھا کر اس میں رنگین رومال رکھا اور جادو کا ڈنڈا اس پر سے گھمایا۔ چند ہی سیکنڈوں میں بیسیوں رومال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ انھیں اکٹھا کرتے کرتے عبدل کا ناک میں دم آگیا۔ رومالوں کے بعد گلاس سے نوٹ نکلنے لگے۔ ایک لڑکے کے سر پر رکھے پیالے میں چاول ابلنے لگے۔ لکڑی کے چوکور ڈبے سے رنگین گیند اچانک غایب ہوگئی اور پھر واپس بھی آگئی۔ اخیر میں عبدل پٹارے کے اندر جا بیٹھا۔ جادوگر نے پٹارے کا منہ کپڑے سے ڈھانکا پھر اس میں اپنا دایاں پیر ڈال دیا پھر بایاں۔ پٹارے میں عبدل کہاں تھا؟ — جادوگر چلایا — "ہائے ہائے لڑکا مر گیا۔ بھوت بن کر جھاڑ پر چلا گیا"۔ بچے حیرت زدہ ہوگئے ان کے دیکھتے دیکھتے عبدل غایب ہو چکا تھا۔ جادوگر نے خالی پٹارا سب کو دکھایا— پھر مرے کی کھوپڑی اپنی پیشانی سے چھو کر ہانک لگائی — "او مست رام۔"

"ہاں —" بچوں نے عبدل کی آواز پہچان لی۔

"تو کدھر ہے ؟"

"میں اِدھر ہوں۔"

"تو آتا کیوں نہیں میرے سامنے ؟"

"نہیں آؤں گا۔"

"نہیں آئے گا؟ کیوں نہیں آئے گا۔"

"مجھے غصہ آگیا ہے۔"

"غصہ کیوں؟"

"مجھے بھوک لگی ہے۔"

"کیا کھائے گا؟ مٹھائی؟"

"ہاں مٹھائی۔"

"اچھا آجا میں دیتا ہوں مٹھائی۔"

جادوگر نے بنسری بجائی۔ ڈمرو کو پٹارے کے اردگرد چکّر دیا پھر بولا — "ہائے میرا لڑکا بھوکا ہے۔ اس کو پیسے دو۔"

باڑی کے بچوں نے جیبوں میں ہاتھ ڈالے جن کے پاس سکّے تھے، انھوں نے خوشی سے بچھے ہوئے کپڑے پر اچھال دیے۔ دوسرے بچّے پیسے لانے کے لیے اپنے اپنے گھروں کی طرف دوڑے چلے گئے۔

"مست رام میرے پاس آجاؤ میں مٹھائی دیتا ہوں۔"

پٹارا آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔ کپڑے کے نیچے کسی کا سر نظر آرہا تھا۔

"آیا۔ آیا! مست رام آگیا۔" بچّے تالیاں بجا کر چلاّئے — مست رام باہر آگیا۔

"اے مست رام۔" جادوگر نے اسے آواز دی۔

"سالا مست رام کس کو بولتا ہے۔ میں باپ ہوں تیرا۔ ہم کو بابا بولو، پپا بولو، ڈیڈی بولو، فادر بولو۔"

"فادر" جادوگر سر جھکا کر بولا۔

"یس" عبدل نے چھاتی اکڑائی۔ "بیٹے مجھے بھوک لگی ہے مٹھائی کدھر ہے؟"

"مٹھائی — بول کیا مانگتا ہے؟ برفی، سوہن حلوہ، گلاب جامن؟" سب کے منہ میں پانی آرہا تھا۔

"پیڑا — ہم کو دو پیڑا مانگتا ہے" — "دو" پر زور دے کر کہا عبدل نے۔

جادوگر نے ہوا میں ہتھیلی گھمائی اور مٹھی بند کر کے کھول دی۔ اس کی ہتھیلی پر دو پیڑے رکھے ہوئے تھے۔ عبدل نے دونوں پیڑے ایک ساتھ منہ میں ڈال لیے۔ پھر ایک لمبی سی ڈکار لی۔ جادوگر نے آسمان کی طرف دیکھا۔ دھوپ اور تیز ہو چکی تھی۔ درختوں کے سایے سمٹتے ہوئے تنوں سے جا چمٹے تھے۔ دونوں باپ بیٹوں نے چہرے سے پسینا پونچھا جادوگر درخت کے نیچے بیٹھ کر سستانے لگا اور عبدل نے سامان سمیٹنا شروع کیا۔ بچے آہستہ آہستہ واپس جانے لگے۔

"یہاں پاس میں کوئی ہوٹل ہے؟" مداری نے بچوں سے پوچھا۔

"نہیں اسٹیشن کی دوسری طرف جانا پڑے گا۔"

جادوگر نے ٹوپی سر پر رکھی۔ عبدل کو دوبارہ پانی لانے کے لیے بھیجا اور ایک بیڑی سلگا کر ہونٹوں سے لگالی۔ اپنے دوست کے کاندھے پر ہات دھرے ہوئے مکّو وہیں کھڑا رہا" جادوگر اور عبدل جیسے سکھی انسان دنیا میں نہ ہوں گے" اس کا دل کہہ رہا تھا۔" مجھے بھی اس طرح بتاجی کے ساتھ گھومنا پھرنا نصیب ہو تو کیا مزا آئے گا۔"

"چل رے مکّو۔ سب جنے جا چکے ہیں۔ چل تاش کھیلیں گے۔" دوست نے کاندھے پر سے مکو کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے اس سے کہا۔ مکّو ہلنے کو تیار نہ تھا۔

"میں جاؤں؟" دوست نے فیصلہ طلب انداز میں پوچھا۔

"بالکل"

"تو اکیلا رہے گا یہاں۔"

"ہاں"

"جادوگر تجھے بھگا لے جائے گا۔"

مکّو نے ڈر کر جادوگر کی طرف دیکھا۔ آنکھیں مچکا کر جادوگر ہنسا، بولا۔"نہیں نہیں اللہ کی قسم، تو تو میرے عبدل جیسا ہے۔"

مکّو بھی ہنس دیا۔ دوست سے بولا۔" دیکھ وہ کیا کہہ رہا ہے۔"

دوست نے پیر کی انگلیوں سے ایک کنکر اٹھا کر ہوا میں اچھالا۔" میں تو جاتا ہوں

تو نہیں آئے گا نا ؟"

"ہرگز نہیں۔"

دوست چلا گیا۔

مکو بہت متجسّس نگاہوں سے سارے سامان پر نگاہیں دوڑا رہا تھا اور دل ہی دل میں عبدل پر رشک کر رہا تھا۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ بڑا ہو کر جادوگر بنے گا۔ چاہو جتنا پیسا، من چاہا کھانا۔ جہاں جی چاہے گھومنا پھرنا، نہ گھر نہ اسکول، روز روز کی مصیبت سے چھٹکارا۔

عبدل پانی لے آیا اور وہ دونوں پانی پینے لگے۔

"عبدل پاس میں ہوٹل تو ہے نہیں۔

"ہاں سالا واندا ہے۔"

"ٹائم کتنا ہو گیا ؟

"ایک بجا ہو گا۔"

"سوا دو کی گاڑی ملے گی۔"

باپ بیٹے دوستوں کی طرح باتیں کر رہے تھے۔ مکو حیرت و تحسین سے دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک عبدل نے پانی کی پتیلی منہ سے ہٹائی اور مکو سے بولا۔ "تذھے ناؤ کائے؟ (تیرا نام کیا ہے ؟) ——" مکرند"۔ مکو نے جواب دیا۔

"تو کدھر رہتا ہے ؟"

مکو نے پیچھے مڑ کر گھر کی طرف انگلی اٹھائی۔

"بیٹا گھر میں کون ہے ؟" عبدل کے باپ نے پوچھا۔

"ماں ہے، دادا ہیں۔ پتاجی کام پر چلے گئے ہیں"۔ مکو کا دل چاہا وہ دیر تک ان سے بولتا رہے۔

"کھانا کھالیا ؟ جیون زھالیں ؟"

"ہاں۔ سویرے ہی پتاجی کے ساتھ۔ اب دوبارہ کھاؤں گا دادا کے ساتھ۔"

جادوگر اور عبدل نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"بیٹا"۔ جادوگر کا لہجہ بدلا ہوا تھا "گھر سے دو روٹیاں لا دو گے؟ بھوک لگی ہے۔ ہوٹل بھی پاس میں نہیں ہے ......"

"ہاں"۔ عبدل نے بھی پیشانی کے بالوں کو پیچھے ہٹا کر باپ کی بیچارگی کا ساتھ دیا۔ "دو روٹی دینا اور کچھ تیکھا ملے تو ......"

مکّو کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ سر پر چاول پکانے والے، ہاتھ کے اشارے سے نوٹ بنانے والے، پیڑے کا نام لیتے ہی پیڑا حاضر کر دینے والے، اُس سے روٹی مانگ رہے تھے۔ اس نے دیکھا عبدل اونگھنے لگ گیا تھا، اس کی پیٹھ پٹارے سے جا لگی تھی اور آنکھیں دھوپ سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں جادوگر کی آواز سنائی دی"۔ مکرند کم سے کم ایک روٹی تو لے آؤ اس عبدل کے لیے تمہارے ہی اتنا ہے۔ اسے بہت بھوک لگ رہی ہے۔"

مکرند نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور آہستہ سے بولا۔ "تم لوگوں کو جادو کے زور سے روٹی لانا نہیں آتا؟ بھوک لگتے ہی جادو کی لکڑی گھما کر جو دل چاہے منگوا لیا کرو۔ نوٹ، روٹی، سب کچھ۔"

عبدل بوجھل آنکھیں کھول کر ہنسا، بولا۔" روٹی کا جادو جانتے تو اس طرح کڑی دھوپ میں مارے مارے کیوں پھرتے؟

"سچ ہے، سچ ہے" جادوگر زمین پر بیڑی بجھاتے ہوئے بولا۔

مکّو عبدل کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔

اس کے الفاظ میں نہ جانے کون سا جادو تھا کہ "جادوگر" اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگا۔

مراٹھی کا نیا افسانہ، مراٹھی کہانیوں میں ایک نئی روایت کا نمائندہ ہے۔ اس نئی لہر نے مراٹھی افسانے کو ایک نئی سمت اور معنویت دی ہے۔ 'بے چہرہ شام' مراٹھی کہانیوں کے اسی نئے رجحان کے نمائندہ افسانوں کا ایک انتخاب ہے۔ جس کی ترتیب و ترجمہ ڈاکٹر یونس اگاسکر کی کاوش کا ثمرہ ہے۔ یونس اگاسکر اردو مراٹھی حلقے میں ایک معتبر و معروف نام ہے۔ اُن کی کتاب 'مراٹھی ادب کا مطالعہ' کی اُردو کے ادبی حلقوں میں بھرپور پذیرائی ہو چکی ہے۔

'بے چہرہ شام' میں شامل افسانوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ افسانے اردو میں پہلی بار ترجمہ ہوئے ہیں اور مترجم نے ان میں دونوں زبانوں کے مزاج کو ممکنہ حد تک ملحوظ رکھنے کا اہتمام کیا ہے۔